جلد۴ شمارہ ۲ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۱

چیلنج

ایڈیٹر: صبیحہ حسن

گل کے روبرو...

یہ اداریہ ایک خط سے شروع کرتے ہیں جو ہمارے پچھلے شمارے کو پڑھنے کے بعد ایک محنت کش نے ہمیں ارسال کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

یہ کسان مزدور ہمیشہ سے مبتلائے آلام چلے آ رہے ہیں۔ مغلوں کے زمانے سے یا اس سے بھی پہلے سے لے کر انگریزوں تک اور پھر انگریزوں کے زمانے سے لے کر آج کی حکومت پاکستان تک ان سب نے پاکستان کے تمام کسانوں اور مزدوروں سے یکساں وحشیانہ سلوک کیا ہے۔ انہیں پہاڑوں کے سنگین اور سخت دامنوں، بنجر زمینوں، سوکھے سڑے میدانوں، خوراک میں کمی جیسے بحرانوں میں رکھا گیا ہے۔ ان کو نہ تو ان کی زمینوں سے کچھ حاصل ہوا اور نہ ہی یہ لوگ تجارت کر سکے ہیں۔ تجارت کے لیے زمانہ حال میں ذرائع آمدورفت اور مواصلات کی ضرورت ہوتی ہے لیکن انہیں کسی قسم کی صنعت وحرفت میں کبھی تربیت حاصل کرنے کا موقع نہیں دیا گیا اور صنعت کی ترقی وتربیت کے لیے تو ایک طویل وپرامن دور کی ضرورت پڑتی ہے۔ کئی کسان مزدوروں کو سو سال سے قحط کی سی صورت حال کا سامنا ہے۔ ان پر روزانہ بمباری اور جنگ مسلط رہتی ہے اور قتل عام ہوتا ہے۔ ان پسماندہ کسانوں اور مزدوروں کو تعلیم کے بجائے سامراجی طاقتیں اپنے فوجیوں کی عملی تربیت کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ اگر ان کے لیے اسکول یا اسپتال قائم بھی کیا گیا تو ان کے ٹھیکے اور تنخواہیں بھی یہی جاگیردار لوگ لیتے ہیں اور اسکول واسپتال کو مال اور مویشیوں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہ لوگ تو ریدی گل ایک خوبصورت اور خودرو صحرائی پھول کے مانند ہیں، پیدا ہو کر پلتے ہیں اور پھر ویسے ہی جنگوں اور پہاڑوں میں مٹی میں مل جاتے ہیں۔ نہ تو انہیں روٹی اور صاف پانی میسر ہے اور نہ ہی کھیت اور باغ کیونکہ یہ کسان تو صرف اگاتے ہیں کھاتے نہیں۔ کیونکہ ان کے پاس خریدنے کی قوت نہیں اور نہ ہی تجارتی منڈیاں ہیں۔ ان کی فصل تو اگانے سے پہلے بک چکی ہوتی ہے۔ ان کے لیے نہ تو زندگی ہے اور نہ زندگی کی ضروریات ولوازمات۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ سنگدل جاگیردار اور سامراج، سوپر پاور اور سرمایہ داران سے کیا چاہتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ انسانیت کے ناطے ان کروڑوں لڑکیوں، عورتوں، غیور جوانوں اور کسانوں پر رحم کریں جن کی محنتوں اور مشقتوں سے یہ لوگ آرام سے کھا پی رہے ہیں، ان کے پیچھے مردم خور لگادیے ہیں مثلاً بی ٹی کپاس، ہائبرڈ بیج اور زہر کی شکل میں اسپرے وغیرہ اور اس پر ستم بالائے ستم تو یہ ہے کہ ان کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے لیے انہیں بے عزت بھی کیا جاتا ہے۔ ''میری آرزو تو یہ ہے'' کہ ان محنت کش، جفاکش، شریف، بہادر، وطن دوست، غیرت مند اور ناموس کے پروانوں کو سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے ظلم وستم سے بچایا جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے ویران اور مسمار گھروں کے ڈھیلوں اور مٹی کو چوم لوں جو وحشی انسانوں نے برباد کیے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان گلی کوچوں اور گھربار کو اپنے ہاتھوں جھاڑو دے کر صاف کروں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کی خون سے لت پت کپڑے اپنے ہاتھوں سے دھوؤں، میں چاہتا ہوں کہ ان سوئے ہوئے کسانوں اور مزدوروں کو جگاؤں اور ان سے سحر کی بات کروں اور پھر یہ خوبصورت انسان دنیا کے سامنے کھڑا کردوں اور دنیا سے کہوں کہ اب آؤ ان سے زیادہ شریف وشائستہ اور متمدن انسان کوئی ہو تو دکھادو!

عبدالخالق دمڑ، زیارت، بلوچستان

عبدالخالق صاحب کی خوبصورت آرزو آتش کے شعر

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبل بے تاب گفتگو کرتے

کی عکاس ہے۔ محنت کشوں کا یہی دمکتا چمکتا چہرہ دکھانے کو خود زندگی شب وروز تڑپ رہی ہے کیونکہ تاریخ کے ارتقاء کی یہی تو منزل مقصود ہے۔ تمام عوام دوست قوتوں کی ساری کوشش انسانیت کے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہے۔ ہمیں کامیابی جب ہی نصیب ہوگی جب ہم استحصال کے پردے کو چاک کرکے استحصالی قوتوں کا اصل چہرہ پوری طرح دکھا سکیں اور پھر اپنی صفوں میں اتحاد قائم رکھتے ہوئے ان قوتوں کو اکھاڑ پھینکنے کا عزم اور صلاحیت اپنے اندر پیدا کرلیں۔ یہ جدوجہد ہمیں ''میں'' سے ''ہم'' جو کہ ۹۹ فیصد ہیں کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ سفر طویل ضرور ہے مگر منزل اب اتنی دور بھی نہیں۔

اس شمارے میں چیلنج کے پرانے شماروں سے کچھ مضامین کا انتخاب کیا گیا ہے جسے ہم اپنے نئے پڑھنے والوں کے لیے خاص طور سے پیش کررہے ہیں تاکہ وہ عالمی تناظر میں اپنے مسائل کی آگاہی حاصل کرنے کے بعد مقامی سطح پر جدوجہد کو آگے بڑھانے کے خدوخال سمجھ سکیں۔ اس شمارے میں پہلے تین مضامین سرمایہ داری نظام کے فروغ پر ہیں۔ پہلے مضمون میں پاکستان کی زرعی پالیسی کا ذکر ہے جس میں زراعت میں سرمایہ کاری کو فروغ دینے کی ترغیب دی جارہی ہے۔ زمین اور اس کی پیداوار سے لے کر سمندری حیات تک ہر چیز عالمی منڈی کے لیے پرکشش بنائی جارہی ہے۔ اس موضوع پر دوسرے دو مضامین اس بات پر زور دیتے ہیں کہ سرمایہ داری نظام کا فروغ پسے ہوئے طبقے کو مزید پیستا ہے۔ اس حوالے سے خواتین اور بچوں کے

حوالے سے نظام کے اثرات پر بات ہوئی ہے۔

اگلے تین مضامین آزاد تجارت کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے ہیں۔ پہلا سامراجیت، آزاد تجارت اور قحط کے تعلق کو تاریخی تناظر میں واضح کرتا ہے۔ دوسرا عالمی زراعتی معاہدے اور اسکے دنیا پر اثرات پر ہے۔ ڈبلیو ٹی او کے ۱۹۹۵ء میں قائم ہونے سے پہلے زراعت آزاد تجارت کے شکنجے میں نہیں آئی تھی۔ تیسرا مضمون ڈبلیو ٹی او کے پانچویں وزارتی اجلاس کا جائزہ لیتا ہے۔ اس میں محنت کشوں کی مزاحمتی طاقت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

دوسری عالمی غذائی کانفرنس جون ۲۰۰۲ء میں روم (اٹلی) میں ہوئی جبکہ پہلی غذائی کانفرنس ۱۹۹۴ء میں ہوئی تھی جس میں ۲۰۱۵ء تک دنیا میں غذائی کمی کے شکار افراد کی تعداد کم کر کے نصف کرنے کا عہد کیا گیا تھا۔ دوسری خوراک کانفرنس تک یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ سالانہ ۲۲ ملین افراد کے بجائے صرف ۶ ملین کو بہ مشکل بھوک کے دائرے سے باہر نکالا جاسکتا ہے۔ ''حق غذا'' پر کئی ترقی یافتہ ممالک کو شدید اختلاف تھا۔ اس کانفرنس نے ثابت کیا کہ آزاد تجارت انسان کے خوراک کے تحفظ پر برتری رکھتی ہے۔ خوراک پر تیسرا مضمون یہ بات واضح کرتا ہے کہ عالمی تجارتی ادارہ اور حق خود ارادیت برائے خوراک کے مقاصد متضاد ہیں۔

جینیاتی انجینئرنگ بیج پر کمپنیوں کی اجارہ داری کو مکمل طریقے سے یقینی بناتی ہے اور یہ ثابت کرتی ہے کہ منافع کے حصول کے لیے کارپوریٹ شعبہ انسانی بھوک ہی کو نہیں بلکہ ماحول اور صحت کو بھی داؤ پر لگا سکتا ہے۔ اس موضوع پر تین مختلف انداز سے بات پیش کی گئی ہے، ایک تحریر صرف خبر کے طور پر ہے، ایک نظم کی صورت میں اور ایک مکمل مضمون ہے جو اس مسئلے پر روشنی ڈالتا ہے۔

کارپوریٹ فارمنگ ہماری زمین اور اثاثوں پر قبضے کا بھرپور انتظام ہے۔ صنعتی زراعت کے ذریعے کمپنیاں (اور دیگر ممالک) لیز پر ہماری زمین لے کر ان پر اپنی پسند کی فصل اگائیں گی اپنے منافع اور تحفظ کے لیے۔ اس سے مقامی آبادی کیسے متاثر ہوگی اس پر ایک مکمل مضمون اس شمارے میں شامل ہے۔

سرمایہ داریت نے ہمارے ماحول کو کس طرح تباہ کیا ہے اس بات کو تو سب سے زیادہ موسمی تبدیلی نے واضح کیا ہے۔ پاکستان اس تبدیلی سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والے ممالک میں سے ایک ہے۔ ایک مضمون جو ۲۰۰۲ میں لکھا گیا (یعنی ۲۰۱۰ اور ۲۰۱۱ کی تباہیوں سے بہت پہلے) اس خطرے پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس مضمون کے بعد دو مضامین پائیدار ترقی کے موضوع پر ہیں۔ پہلا مضمون دوسری عالمی کانفرنس برائے پائیدار ترقی پر ہے۔ اس سلسلے کی پہلی عالمی کانفرنس ارتھ سمٹ (Earth Summit)، ریو، برازیل میں ۱۹۹۲ء میں ہوئی۔ اس میں پائیدار ترقی کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا کیونکہ سرمایہ داریت نے زمین کے وسائل کو بڑی تیزی سے ختم اور تباہ کیا ہے جس کے بھیانک نتائج واضح ہونا شروع ہو چکے ہیں۔ دوسری کانفرنس کو تجزیہ نگاروں نے ایک ناکام کانفرنس قرار دیا کیونکہ کانفرنس کی تشکیل انہی قوتوں کے زیر اثر ہوئی جو بڑھتی ہوئی غربت اور ماحولیاتی تباہی کے ذمہ دار ہیں۔ اقوام متحدہ نے پائیدار ترقی کا بیڑا اٹھایا ہے لیکن اس مقصد کے لیے نجی شراکت داری پر توجہ مرکوز رکھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سرمایہ داریت پر مبنی معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ ماحولیاتی بچاؤ کو ممکن بنایا جائے۔ یہ دونوں باتیں کتنی متصادم ہیں اس کا ثبوت ۱۹۹۵ء میں ڈبلیو ٹی او کا قیام ہے جس نے سرمایہ داریت کو عالم گیریت کے نعرہ کے ساتھ دنیا پر مسلط کر کے ۱۹۹۲ء کی ریو کانفرنس میں اٹھائی جانے والوں خوش آئند باتوں کو ایک ذیلی حیثیت دے کر بالکل بے اثر کر دیا ہے۔

یہ مضامین تقریباً دس سال پہلے لکھے گئے تھے۔ ان میں بیان تمام خطرات حقیقت کا روپ دھار چکے ہیں مثلاً بی ٹی کپاس سے جو اثرات کی توقع تھی وہ سارے کے سارے پورے ہو رہے ہیں۔ اس حوالے سے روٹس فار ایکوٹی نے ۲۰۱۱ء میں پنجاب اور سندھ کے کئی ضلعوں میں بی ٹی کپاس کے خلاف مہم چلائی۔ ان ضلعوں میں ٹنڈو محمد خان، ماتلی، ٹنڈو الہ یار، نواب شاہ، بدین، ملتان، راجن پور شامل ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ چھوٹے کسان اور بے زمین کسان اور زرعی مزدور عورتیں جو بی ٹی کپاس کی چنائی کرتی ہیں اس فصل کے سخت خلاف ہیں۔ کسانوں کی طرف سے پیش کیے گئی جواز میں سے کچھ یہاں درج کیے جا رہے ہیں۔

- کئی نئی طرح کے کیڑے اب بی ٹی کپاس کی فصل پر شدید حملہ آور ہوئے ہیں۔ خاص کر کے چوسنے والے کیڑوں کے علاوہ میلی بگ (جیسے کسان 'ملی بھگت' کہتے ہیں) سامنے آئے ہیں۔
- بی ٹی کپاس کی اچھی فصل کی پیداوار کے لیے فصل آٹھ مہینے کی ہوتی ہے جس کا مطلب ہے کہ کسان گندم کی فصل نہیں لگا سکتے۔
- بی ٹی کپاس روایتی کپاس سے کہیں زیادہ پانی مانگتی ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ پاکستان کے زرعی پانی کے بحران میں کئی گنا اضافہ ہو جائے گا۔

اس شمارے کو پڑھنے کے بعد اپنی رائے سے ہمیں ضرور مطلع کریں۔ ہر شمارے کے آخر میں زراعت سے جڑے مسائل پر اخباری خبروں کا جائزہ اور اس پر تبصرہ پیش کیا جاتا ہے اس شمارے میں اسے شامل نہیں کیا گیا ہے۔

چھ مہینے کی زرعی خبریں اور ان کا تجزیہ ہمارے اگلے شمارے کا موضوع بنے گا۔

فہرست مضامین

زرعی سرمایہ کاری پالیسی..... 3
ماحولیات اور عورت 6
پاکستان میں زرعی شعبہ سے وابستہ بچے.. 9
سامراجیت، آزاد تجارت 12
عالمی زراعتی معاہدہ اور تیسری دنیا 14
کینکون وزارتی اجلاس کی ناکامی 17
دوسری عالمی خوراک کانفرنس..... 20
عالمی تجارتی ادارہ اور حق خودارادیت 23
ہوشیار ..... مضر صحت سویابین 27
جینیاتی انجینئرنگ اور کاشتکاری..... 30
کارپوریٹ فارمنگ اسباب واثرات..... 33
خشک سالی اور ریاستی وعالمی اداروں..... 35
زہر صرف زہر ہے..... 38
دوسری عالمی کانفرنس برائے پائیدار ترقی.. 40
پائیدار ترقی کی جانب مثبت اقدامات..... 41

چیلنج روٹس فار ایکوٹی (Roots for Equity) نے آکسفیم نویب کے تعاون سے شائع کیا ہے۔

سیکرٹریٹ: اے۔1، فرسٹ فلور، بلاک 2، گلشن اقبال، کراچی
فون، فیکس 3320 3481 21 92+ فیکس 3321 3481 21 92+
ای میل: roots@super.net.pk

زرعی سرمایہ کاری پالیسی: سرکار، جی۔۸ اور بین الاقوامی کمپنیوں کا گٹھ جوڑ*

عذرا طلعت سعید

تیسری دنیا کے دیگر ممالک کی طرح پاکستان میں بھی ترقی یافتہ ممالک کی صف میں شامل ہونے کے لیے معاشی ترقی کو اپنانے پر زور دیا جاتا ہے۔ حکومت معاشی ترقی کے حصول کے لیے سرمایہ کاری کی ایسی پالیسیاں اپنائے ہوئے ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کا خاصہ ہیں۔ غیر ملکی سرمایہ کاری کے حصول کی خاطر ملک میں پرکشش مراعات دی جارہی ہیں۔ اس سلسلے میں دیگر وزارتوں اور محکموں کی طرح وفاقی وزارت زراعت و مال مویشی (مین فال) نے بھی ملک میں سرمایہ کاری کے فروغ کے لیے یہاں موجود وسائل اور اثاثہ جات کا خاص طور پر ذکر کیا ہے جس میں قابل کاشت زمین، مختلف فصلیں (گندم، کپاس، چاول، پھل اور سبزیاں)، ماہی پروری اور مال مویشی شامل ہیں۔ حکومت نے جن مخصوص شعبوں میں سرمایہ کاری کی نشاندہی کی ہے ان میں ماہی پروری سے جڑی ہوئی صنعتیں، بھیڑ اور بکرے کے گوشت کی پیداوار، ڈیری کی مصنوعات کا کاروبار (دودھ اور اس سے بننے والی اشیاء کا کاروبار)، خشک سبزیوں کی پیداوار، ٹماٹر کی چٹنی (ٹماٹو پیسٹ) کے علاوہ سورج مکھی کی مصنوعی بیج کی پیداوار شامل ہے۔[1]

زراعت میں سرمایہ داری نظام کی طرف پیش قدمی تیز کرنے کی خاطر حکومت پاکستان نے سرمایہ کاری کے لیے ایسی زرعی پالیسی اپنائی ہے جس میں کارپوریٹ طریقہ کاشتکاری (کارپوریٹ فارمنگ) بھی شامل ہے۔ کارپوریٹ طریقہ کاشتکاری کے تحت منظور شدہ زرعی کمپنیوں کو زمین حاصل کرنے پر کوئی پابندی نہیں، وہ جتنی زمین چاہے خرید سکتی ہیں یا لیز پر لے سکتی ہیں۔ لیز کی مدت پہلے مرحلے میں ۵۰ سال ہوگی جبکہ اس مدت کو مزید ۴۹ سال تک بڑھایا جاسکتا ہے۔ غیر ملکی کمپنیاں سو فیصد حصے دار بن سکتی ہیں اور انھیں منافع اور سرمائے کو ملک سے باہر بھیجنے کی مکمل آزادی بھی حاصل ہوگی۔ جو زرعی کمپنیاں کارپوریٹ فارمنگ میں حصہ لینا چاہیں گی، ان کو مختلف بینک قرضہ جات کی اسکیم فراہم کریں گے۔ زراعت کے شعبے سے متعلق مشینری کی درآمد پر کوئی ٹیکس نہیں لگایا جائے گا۔ اس کے علاوہ برآمدی پیداوار کے لیے جو بھی خام مال درآمد کیا جائے گا اس پر درآمدی ٹیکس نافذ نہیں کیا جائے گا۔

پاکستان سرمایہ کاری بورڈ نے مختلف زرعی اشیاء کی پیداوار اور مارکیٹ میں کامیابی کے امکانات کی نشاندہی کی ہے مثلاً بیج کی پیداوار کے لیے یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ فی کیلوگرام بیج ۲۵۰ سے ۳۰۰ روپے تک کسانوں کو بیچے جاسکتے ہیں۔ اس قیمت میں ۱۰۰ سے ۱۳۰ روپے فی کلوگرام منافع شامل ہے یعنی منافع کی شرح ۴۰ سے ۴۳ فیصد تک بتائی گئی ہے۔ ہر چیز کی برآمدی صلاحیت کی اہمیت کو مدنظر رکھا گیا ہے مثلاً گوشت، مچھلی، پھلوں کا جوس اور خشک دودھ جیسی اشیاء کو اسی وجہ سے پیداوار میں خاص جگہ دی گئی ہے۔

ماہی پروری کے حوالے سے اس بات کی نشاندہی کی گئی ہے کہ پاکستان کے پاس تقریباً ۲۵۰,۰۰۰ مربع کیلومیٹر کا رقبہ موجود ہے۔ خیال یہ ہے کہ پاکستان کے ماہی گیری زون میں کئی طرح کی سمندری مچھلیاں موجود ہیں اس لیے بین الاقوامی سرمائے کو اس شعبے کی طرف راغب کرنے میں کوئی خاص مشکل پیش نہیں آئے گی۔ تازہ مچھلی کے علاوہ کھانے کے لیے نیم تیار شدہ یا تیار شدہ مچھلی کی مارکیٹ کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ مصنوعی طور پر جھینگے کی افزائش اور پیداواری نظام کو پاکستان میں قائم کرنے کی بھی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ اگرچہ پاکستان میں اب تک اس طرز کے جھینگے کی پیداوار نہیں ہوتی ہے لیکن بتایا گیا ہے کہ بنگلہ دیش میں بھی ۱۹۷۰ء کے بعد ہی جھینگے کی پیداوار اس طریقے کار کے مطابق شروع کی گئی اور اب اس کا شمار بنگلہ دیش کے ایک اہم پیداواری یونٹ میں ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ پاکستانی حکومت شعبہ زراعت کو کارپوریٹ فارمنگ یا سرمایہ داری نظام کے حوالے کرنے پر تیار بیٹھی ہے۔ بظاہر یہ تمام منصوبہ بندی اور معاشی ترقی پر مبنی اقدامات اتفاقی اور پاکستانی حکومت کی وضع کردہ پالیسیوں کا حصہ نظر آتے ہیں لیکن کارپوریٹ فارمنگ کا نفاذ بین الاقوامی زرعی کمپنیوں کے پرزور دباؤ کے تحت ہورہا ہے۔ عالمی زراعتی معاہدہ جو کہ ڈبلیو ٹی او کے تحت نافذ کیا گیا ہے انہی کمپنیوں کی سازش کا نتیجہ ہے۔ عالمی سطح پر زراعت اور اناج سے وابستہ کاروبار اور تجارت پر صرف ۵ بین الاقوامی کمپنیوں کا قبضہ ہے جب کہ ۱۰ بین الاقوامی کمپنیاں پوری دنیا میں استعمال ہونے والے ۴۰ فیصد بیج پر ملکیت کے اختیارات رکھتی ہیں۔[2] دنیا پر بین الاقوامی کمپنیوں کے شکنجے کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۹۰ فیصد ٹیکنالوجی پر ان ہی کی گرفت ہے۔ دنیا میں موجود زیادہ تر اثاثے کی مالک ۱۰۰ بین الاقوامی کمپنیاں ہیں۔ ۲۰۰۰ء میں ان کی کل آمدنی ۶ء۶ ٹریلین ڈالرز تھی۔[3] ان میں سے ۹۰ فیصد بین لاقوامی کمپنیوں کا تعلق امریکہ (۶۱ فیصد)، یورپ (۳۳ فیصد) اور جاپان (۲ فیصد) سے ہے۔[4] دنیا بھر میں ان بین الاقوامی کمپنیوں کی طاقت اور اس کے آمرانہ استعمال پر شدید احتجاج ہورہا ہے۔ یہ کمپنیاں اپنی معاشی طاقت کے ذریعے اپنی حکومتوں کی سرمایہ دارانہ پالیسیوں کو نافذ کروانے میں برابر کی شریک ہیں۔ عالمی سطح پر ڈبلیو ٹی او کے تحت زراعت کے حوالے سے دو سنگین معاہدے نافذ ہوئے ہیں، ان میں عالمی زراعتی معاہدہ (اے او اے) اور ذہنی ملکیت کا معاہدہ (ٹرپس) شامل ہیں۔ نہ صرف یہ دو معاہدے بلکہ ڈبلیو ٹی او خود بھی ان کمپنیوں کے حقوق کی حفاظت اور دنیا کے ہر ملک میں تجارت کے حوالے سے زبردستی گھسنے کے لیے بنایا گیا ہے۔

پاکستان سمیت ڈبلیو ٹی او کے دیگر تمام ممبر ممالک نے عالمی زراعتی معاہدے کے تحت بین الاقوامی کمپنیوں کو اختیار دے دیا ہے کہ وہ جدید سرمایہ دارانہ

* چیلنج، جنوری تا مارچ ۲۰۰۲ء، صفحہ ۵ تا ۷۔

طریقوں اور اصولوں کو بروئے کار لاتے ہوئے زرعی پیداوار اور کاروبار کریں۔ اوپر پیش کی گئی تفصیلات سے ثابت ہوتا ہے کہ حکومت پاکستان، ترقی یافتہ ممالک کے ساتھ ملکر ملک میں بین الاقوامی زرعی کمپنیوں کے تسلط کو نافذ کرنے میں پوری طرح ملوث ہے۔

اس سازش کی اگلی کڑی اس وقت کھل کر سامنے آئے گی جب پاکستانی حکومت پلانٹ بریڈرز رائٹس ایکٹ کو مکمل کر کے ملک میں نافذ کرے گی۔ ۱۹۶۱ء میں یو پی او وی کنونشن دراصل نئی طرح کے بیج اور فصلوں کو بنانے والے کاشتکاروں کو اپنی ایجادات پر خاص تحفظ فراہم کرنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس کنونشن سے حاصل شدہ مسودے کو ۱۹۷۲ء، ۱۹۷۸ء اور ۱۹۹۱ء میں نئی ترامیم کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ بین الاقوامی زرعی کمپنیوں کے مفادات کو مدنظر رکھتے ہوئے اصل مسودے میں آخری ترمیم ۱۹۹۱ء میں کی گئی۔ اس مسودے کے تحت اگر کوئی کاشتکار ایسا بیج استعمال کرتا ہے جس کا حق ملکیت کا معاوضہ (رائلٹی) اس نے بیج کے ''ذہنی مالک'' کو نہیں دیا ہے تو وہ فصل کھو سکتا ہے اور بیج کا ''مالک'' اس فصل کا حقدار بن سکتا ہے۔ یو پی او وی ۱۹۷۸ء کے تحت کاشتکار کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ بیج کو آئندہ فصل اگانے کے لیے محفوظ کر سکتے تھے۔ لیکن ۱۹۹۱ء کی نئی ترمیم کے بعد صورت حال ایسی ہے کہ کاشتکار ذہنی ملکیت رکھنے والے بیج کو اس وقت ہی استعمال کر سکتا ہے جب اس کے اپنے ملک کی حکومت نے اپنے پلانٹ بریڈرز رائٹس ایکٹ میں اس حق کو محفوظ رکھا ہو۔[۵]

جنرل مشرف نے پچھلے سال مختلف غیر ملکی بین الاقوامی زرعی کمپنیوں سے یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ جلد ہی پلانٹ بریڈرز رائٹس ایکٹ کو ملک میں نافذ کر دیں گے۔[۶] اس ایکٹ کے نافذ ہوتے ہی بین الاقوامی کمپنیاں جینیاتی انجینئرنگ کے تحت بنے بیج کو ملک بھر میں استعمال کرنا شروع کر دیں گی۔ شائد ہمارے ملک کے رہنماؤں کو یہ علم نہیں ہے کہ جینیاتی انجینئرنگ سے حاصل کی ہوئی بیج و فصل کے استعمال پر دنیا بھر کے سائنس دان، کاشتکار اور عوام سخت پریشان اور خوف زدہ ہیں۔ سائنسی تحقیق یہ بتاتی ہے کہ یہ بیج ماحول اور صحت، دونوں کو بے تحاشہ نقصان پہنچا سکتا ہے۔ یہ یاد رہے کہ ایک بین الاقوامی معاہدے، کارٹیجینہ پروٹوکول کے تحت جینیاتی انجینئرنگ سے حاصل شدہ بیج، پودوں اور جانوروں کی پیداوار کو پاکستان میں روکا جا سکتا ہے۔

مونسانٹو بہت بڑی بین الاقوامی زرعی کمپنی ہے، جس نے کپاس کی فصل کے لیے ایک نئی جینیاتی بیج بی ٹی کاٹن ایجاد کیا ہے اور اس کے حق ملکیت کی دعوے دار ہے۔ پلانٹ بریڈرز رائٹس ایکٹ نافذ ہوتے ہی مونسانٹو اس بیج کا استعمال پاکستان میں شروع کر سکتی ہے۔ بھارتی حکومت نے بی ٹی کاٹن کے استعمال کی پہلے ہی اجازت دے دی ہے۔ اس اجازت نامے پر بھارتی کاشتکاروں نے سخت مزاحمت ظاہر کرنے کا اعلان کیا ہے۔ کچھ گروہوں کا کہنا ہے کہ جہاں جہاں پر بی ٹی کاٹن سے فصل اگائی جائے گی اس کو جلا دیا جائے گا۔ دنیا بھر سے اس بیج کی کاشت سے فصلوں اور ماحول کو نقصان پہنچنے کی خبریں آ رہی ہیں۔

فی الحال پاکستان میں پلانٹ بریڈرز رائٹس کا ایک نامکمل مسودہ موجود ہے جو بین الاقوامی کمپنیوں کے حق میں ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت اس مسودے کو تبدیل کر کے ایسا مسودہ تیار کرے جو کہ ملک کے چھوٹے کاشتکار کے حق میں ہو مثلاً جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ آج کل جینیاتی بیج کے علاوہ بھی مصنوعی بیج کے ذہنی ملکیت کے حقوق کس کے پاس ہیں؟ اس بات کی نشاندہی کی گئی ہے کہ آسٹریلیا اور اسرائیل سمیت ترقی یافتہ ممالک میں آم کی نئی فصلوں کو پلانٹ بریڈرز رائٹس کے تحت کاشت کیا جا رہا ہے اور نئی اقسام اگائی جا رہی ہیں۔[۷] لیکن ان میں سے ہر ایک نئے قسم کے پودے کا جینیاتی مادہ، ان ہزاروں آم کے پودوں کی اقسام سے لیا گیا ہے جو کہ تیسری دنیا کے کاشتکاروں نے صدیوں سے آم کے مختلف پودوں کے بیج سے ملا کر پیدا کیے ہیں۔ ایک طرف تیسری دنیا کے کاشتکاروں کی ہزاروں سال کی محنت، تجربہ اور ذہنی ملکیت کا اب کوئی محافظ نہیں اور دوسری طرف چند دہائیوں کی تحقیق کی بنیاد پر نئے پودوں کا مکمل حق پہلی دنیا کی زرعی کمپنیوں سے جڑے ہوئے صنعتی کاشتکاروں کو دے دیا گیا ہے۔ اس طرح سے اگر اب ہم نئے پودوں کے مصنوعی بیج کو استعمال کرتے ہیں تو ہمیں بیج کے مالکوں کو رائلٹی دینی پڑے گی۔ ہمارے ملک میں ۹۳ فیصد سے زائد چھوٹے کاشتکار ہیں اور انہی کی انتھک محنت کی بنیاد پر پورا ملک غذا حاصل کرتا ہے۔ اگر ہم ان کے حقوق کی حفاظت نہیں کریں گے تو نہ صرف ان کاشتکاروں کے روزگار اور غذائی ضروریات بلکہ پورے قوم کے تحفظ خوراک سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ بڑی بڑی کارپوریشنوں کو غلہ اگانے اور تحفظ خوراک سے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ ان کا مقصد صرف منافع کمانا ہے۔ اسی لیے یہ کمپنیاں نقد آور برآمدی فصلوں کو اگانے پر زور دیتی ہیں۔

زراعت کے بارے میں سرمایہ کاری پالیسی کے تحت حکومت پاکستان نے بین الاقوامی کمپنیوں کی ترغیب کے لیے کھل کر اپنا زرعی اثاثہ بیان کیا ہے مثلاً ماہی گیری سے پکڑی جانے والی مچھلی ۵ء۷ ملین ٹن، بھینس کی کل تعداد ۲۳ ملین، بھیڑ اور بکری ۷۵ ملین اس کے علاوہ یہ کہا گیا ہے کہ دودھ اور دودھ سے بنی ہوئی اشیاء پاکستان میں دوسرے ممالک کی بہ نسبت بہتر مقدار میں حاصل ہوتی ہیں۔ حکومت پاکستان کا خیال ہے کہ دودھ پیدا کرنے والے جانوروں کا جینیاتی مواد بہت اچھا ہے۔ آج کل سرمائے کے لیے جینیاتی مواد ایک نہایت اہم منافع بخش کاروبار تسلیم کیا جاتا ہے۔ ٹرپس اور یو پی او وی ۱۹۹۱ء کی بنیاد اس مواد کو حاصل کرنا اور جینیاتی انجینئرنگ کے تحت مختلف جانور اور پودوں کی پیداوار پر بین الاقوامی کمپنیوں کے ذہنی ملکیت کو رائج کرنا ہی ہے۔ جب ہم ایسا پلانٹ بریڈرز رائٹس ایکٹ نافذ کر دیں گے جو کہ بین الاقوامی کمپنیوں کو اس کا حق دار بنائے گا کہ وہ ہمارے ملک کے جینیاتی مواد کو حاصل کر کے اپنی ملکیت بنا لے نتیجتاً غریب کسان ہر طرح کے اثاثہ سے محروم ہو جائے گا۔ ایسی گائے یا بھینس کی جینیاتی انجینئرنگ کے تحت پیداوار کی جائے گی جن پر کسان کا کوئی حق نہیں رہے گا۔ یہ زرعی کمپنیوں کی ملکیت ہو جائے گی۔ اس طرح سے ہمارے کسان ان جانوروں اور پودوں پر سے اپنا اختیار کھو دیں گے جو کہ ہزاروں سال کی کاوش سے آج دنیا میں اپنی بہتر جینیاتی خصوصیات کے لیے مشہور ہیں۔

حکومت پاکستان اپنی سرمایہ کاری کے لیے دی گئی ترغیبات کے پرچار میں

بڑی فخر سے کہتی ہے کہ پاکستان میں غیر ملکی سرمایہ کے لیے ایک پرکشش ماحول ۱۴۰ ملین شہریوں کی وجہ سے بھی پایا جاتا ہے۔ اس آبادی کی بڑھتی ہوئی قوت خرید کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ غیر ملکی کمپنیوں کی اشیاء کی فروخت کے لیے ایک بڑی مارکیٹ موجود ہے اور اس طرح یہ کمپنیاں یہاں مال فروخت کر کے منافع کمانے میں کامیاب ہوسکتی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے حکومت پاکستان کسی اور ہی ملک اور اس کے باشندوں کا ذکر کر رہی ہو۔ شائد سرکار یہ بھول گئی ہے کہ اس کے اپنے اعداد و شمار کے مطابق پاکستان میں ۴۷ فیصد لوگ غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارتے ہیں، ۸ مزید یہ کہ پچھلے ۱۰ سالوں میں غربت کی لکیر سے نیچے رہنے والوں کی تعداد ۱۰ فیصد بڑھی ہے۔ غربت بڑھنے کی ایک اہم وجہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے تجویز شدہ نج کاری کی پالیسیاں بھی ہیں۔ پوری دنیا میں کہیں پر بھی آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی ان پالیسیوں کے تحت غربت میں کمی نہیں آئی بلکہ ہر خطے سے غربت اور افلاس بڑھنے کی خبریں موصول ہو رہی ہیں۔ خود ورلڈ بینک بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ اس کی پالیسیوں کے باعث غریب عوام کو مزید مفلسی کا سامنا ہے۔ اس کے علاوہ بے تحاشہ رپورٹس اور تحقیقات ثابت کرتی ہیں کہ عالمی زراعتی معاہدے اور آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی مختلف پالیسیاں بہت تیزی سے تیسری دنیا کے زرعی ممالک میں معاشی اور معاشرتی ترقی لانے میں ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں حکومت پاکستان کا یہ خیال کہ ہماری ۱۴۰ ملین عوام کی قوت خرید میں اضافہ ہونے والا ہے، انتہائی غیر ذمہ دارانہ ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنی معاشی پالیسی کو نج کاری اور سرمایہ دارانہ نظام کے حوالے کرنے کے بجائے عوام کی خوش حالی کو مدنظر رکھ کر بنائیں۔ اس سلسلے میں ایک اہم قدم یہ ہوسکتا ہے کہ پاکستان، تیسری دنیا کے دیگر ممالک کے ساتھ مل کر اس بات پر ڈٹ جائے کہ زراعت اور ٹرپس کے معاہدے ڈبلیو ٹی او سے مکمل طور پر خارج کر دیے جائیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سارے عارضی اور نامکمل ترکیبیں ہیں کیونکہ جب تک کہ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت پالیسیاں مرتب کی جائیں گی غریب کا استحصال ختم نہیں ہوسکتا۔ سرمائے کی بنیاد مزدور اور کسان کی محنت پر قبضہ ہے۔ اس لیے جب تک اس نظام کا مکمل طور پر خاتمہ نہیں کیا جائے گا، انسانی فلاح و بہبود کے لیے کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوسکتی۔

حوالہ جات:

۱۔ (http://www.pakboi.gov.pk)

۲۔ ایڈواچ، اے پی آر این، کارپوریٹ پاور آر پیپلز پاور: ٹی این سیز اینڈ گلوبلائیزیشن ۲۷-۲۹، ستمبر ۲۰۰۱ء، ورکشاپ پیپرز، صفحہ ۱۸۔

۳۔ کنول جیت سنگھ، نیولبرل گلوبلائیزیشن اینڈ ڈیموکریسی: کریٹیکل ایشوز اینڈ پرسپیکٹیوز، پبلک انٹرسٹ ریسرچ سینٹر، دہلی، ۲۰۰۲ء۔

۴۔ جیمس پیٹراس اینڈ ہنری ویلٹمیئر، گلوبلائزیشن ان ماسکٹ، زیڈ بکس، ۲۰۰۱ء، صفحہ ۶۲۔

۵۔ رابرٹ علی بریک ایٹ آل، بریو نیو سیڈز، زیڈ بکس، ۲۰۰۰ء، صفحہ ۹۹۔

۶۔ ڈاکٹر عابد سلہیری، دی نیوز، کراچی، یکم، جولائی ۲۰۰۱ء۔

۷۔ ایم ایچ پھنور اور فرزانہ پھنور، ایکونومک اینڈ بزنس ریویو، ڈان، کراچی، ۹، دسمبر ۱۹۹۵ء۔

۸۔ گورنمنٹ آف پاکستان پلاننگ کمیشن، تھری ایئر پاورٹی ریڈکشن پروگرام ۲۰۰۱ء-۲۰۰۴ء، اسلام آباد، ۲۰۰۱ء۔

زراعت کا تاریک مستقبل: روشن ملک کے ساتھ گفتگو سے اقتباس

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ملک میں ۹۳ فیصد کھیتی باڑی کرنے والے چھوٹے کاشتکار ہیں، جنکی ملکیت زمین ۱۲٫۵ ایکڑ سے کم ہے۔ یہ کاشتکار اپنی خوراک کی ضرورت پورے کرنے کی خاطر کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ زیادہ پیداواری لاگت کی وجہ سے ان کے لیے گزارہ کرنا مشکل ہوگیا ہے۔ لیکن خود اناج پیدا کرنے کی وجہ سے انہوں نے تحفظ خوراک کی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے اور اس طرح حکومت کو اس مسئلہ سے کسی حد تک بری الزمہ کر دیا ہے۔ ایشیائی ترقیاتی بینک کے ۱۹۹۸ء کے رپورٹ کے مطابق پاکستان میں ہر سال غربت میں اضافہ کے ساتھ ساتھ تحفظ خوراک کے غیر محفوظ ہونے میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ اس صورتحال کو ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن (ڈبلیو ٹی او) کے معاہدے خاص طور پر زراعت کا عالمی معاہدہ (اے او اے) اور تجارت سے متعلق ذہنی ملکیت کا معاہدہ (ٹرپس) مزید گھمبیر بنا رہے ہیں۔

ان حالات کے پیش نظر حال ہی میں روزنامہ ڈان نے گلوبلائیزیشن کے خلاف سرگرم فرد روشن ملک سے گفتگو کی۔ جس میں انہوں نے آزاد تجارت اور ملکی زراعت سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا کہ بہت جلد کم ترقی پزیر ممالک میں ملکی قوانین کی جگہ بین الاقوامی قوانین لے لیں گے اور یہ پاکستان جیسے ممالک کے لیے ایک مشکل صورتحال کو جنم دیگی اور یہ کہ اے او اے کے تحت کم ترقی یافتہ اور ترقی پزیر ممالک میں بین الاقوامی کمپنیوں کو مقامی طور پر زرعی اشیاء پیدا کرنے والوں پر سبقت حاصل ہوجائے گی۔ ترقی پزیر ممالک کو پابند بنا دیا گیا ہے کہ وہ اپنی زراعت کے شعبے کی امداد کے طور پر عائد کرنے والے درآمدی ٹیکس کم کر دیں جبکہ امریکہ اور یورپ کے ترقی یافتہ ممالک کو انتہائی چالاکی کے ساتھ مقامی امداد کے بہانے سے ان پابندیوں سے مستثنیٰ قرار دے دیے گئے ہیں۔ روشن ملک نے ٹرپس کے معاہدے کے مضمرات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اس معاہدے کے تحت بیج پر بین الاقوامی کمپنیوں کے حق ملکیت کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ جس کے بعد خلاف ورزی کرنے والے کسانوں کے خلاف قانونی کاروائی کی جائے گی۔ بین الاقوامی کمپنیوں نے ان قوانین سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کئی پودوں کے حقوق ملکیت حاصل کر لیے ہیں جن میں باسمتی چاول، نیم، ہلدی، انار اور سرسوں شامل ہیں۔ اب تجارت سے متعلق ذہنی ملکیت کے معاہدے (ٹرپس) کے تحت کسان اگر ان بیجوں کا استعمال کرے گا تو اسکے خلاف قانونی کاروائی ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ گلوبلائیزیشن کا مطمع نظر پاکستان جیسے ترقی پزیر ممالک میں کارپوریٹ طریقہ زراعت متعارف کروانا ہے، جس کے نتیجے میں مقامی کاشتکار مقابلہ سے خارج ہوجائے گا جس کے بعد اس کے پاس اپنی زمین کو بڑی کارپوریشنوں کے ہاتھوں بیچنے کے سوا کوئی چارہ نہیں بچے گا۔ روشن ملک نے زور دے کر کہا کہ ''جس چیز کو لوگ نہیں سمجھ رہے ہیں وہ ڈبلیو ٹی او، عالمی زراعتی معاہدہ اور ٹرپس جیسے معاہدوں کی صورت میں منڈلاتے ہوئے وہ خطرات ہیں جس کی وجہ سے مکمل معاشی و سماجی تبدیلی واقع ہوگی۔''

(ڈان، کراچی، ۳، اپریل ۲۰۰۲ء)

ماحولیات اور عورت پر سرمایہ دارانہ نظام کے اثرات*

عذرا طلعت سعید

سماج عورت کو گھرانے کا ''خدمتگار'' قرار دیتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ عورت پورے خاندان کی دیکھ بھال کی مکمل ذمہ دار ہے۔ بیشتر کاموں میں سے غذا کی فراہمی جیسا بنیادی فریضہ بھی عورت کے سپرد کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ افزائش نسل بھی اسی کی ذمہ داری تصور کی جاتی ہے۔ چونکہ عورت اولاد کو اپنے جسم سے غذا فراہم کرتی ہے اسی لیے اس بندھن کو قدرت سے جوڑ دیا جاتا ہے یعنی عورت کا خوراک فراہم کرنا ایک قدرتی فعل سمجھا جاتا ہے۔ روایتی طور پر اس ذمہ داری کو نبھانے کے لیے دیہات کی عورت نہ صرف ماحول میں پائے جانے والے وسائل کو اپنے اور اپنے خاندان کے لیے استعمال کرتی ہے بلکہ ان وسائل کی حفاظت کی ذمہ داری بھی اٹھاتی رہی ہے۔ اس کی نظر میں اس کے خاندان کی بقاء قدرتی وسائل کی فراہمی سے جڑی ہوئی ہے۔

سرمایہ داری نظام کے ساتھ جو ترقیاتی منصوبے وجود میں آئے اس نے صنعت کاری کو شدت سے فروغ دیا۔ ان منصوبوں نے ان پرانی روایات اور طریقوں کو کم پیداواری صلاحیت کی بنیاد پر فرسودہ اور دقیانوسی قرار دے کر عام استعمال سے خارج کر دیا۔ اس طرح سرمائے کو جمع کرنے کے لیے تیز تر پیداواری نظام کو فروغ دیا گیا اور عورت، جو کہ زراعت اور خوراک کی پیداوار سے وابستہ تھی، کو نظر انداز کر دیا گیا۔ آج کے دور میں جب گلوبلائزیشن (دوسرے لفظوں میں جدید سرمایہ داری نظام) نے زراعت کو صنعت کا درجہ دے دیا ہے، عورت اس نظام میں مزدور کی حیثیت سے کام تو کرتی ہے لیکن ماحولیات کی بربادی کی وجہ سے اپنے اور خاندان کے لیے خوراک پیدا کرنے اور دستیابی میں سنگین مشکلات کا سامنا بھی کر رہی ہے۔ جدید پیداواری نظام میں کم ہوتے ہوئے قدرتی وسائل سے جو کچھ جوڑ توڑ کر وہ حاصل کرتی ہے، سرمایہ دارانہ نظام اسی کو ماحولیات کی بربادی کا الزام دیتا ہے۔

زراعت میں مشینری کے استعمال نے ہزاروں، لاکھوں کسانوں کو مزدوری کی طرف دھکیل دیا ہے اور انھیں مجبور کیا ہے کہ وہ روزی کی تلاش میں شہروں کا رخ کریں۔ دیہات سے آئی ہوئی عورت شہر کے ماحول میں سب سے زیادہ پیسی جاتی ہے کیونکہ وہ اس ماحول سے ناواقف ہوتی ہے۔

اگر ہم اس تناظر میں پاکستانی مزدور عورت کا جائزہ لیں تو سمجھ میں آتا ہے کہ جاگیردارانہ، سرمایہ دارانہ اور پدرشاہی نظام نے عورت کو کس قدر پیسا ہے۔ پاکستان کی ۶۷ فیصد عوام دیہات میں رہتی ہے جو قدرتی وسائل کے استعمال سے ہی اپنا گزر بسر کرتی ہے۔ عورت قدرت سے گھر بنانے کے لیے لکڑی اور مٹی، جانور کے لیے چارہ، خاندان کے لیے اناج، سبزی، دودھ اور پانی حاصل کرتی ہے۔ اس سارے کام کی ذمہ داری عورت کے سر پر ہے لیکن کسی بھی کام کا فیصلہ کرنے کا اس کو حق نہیں دیا جاتا۔ سب سے بڑا ثبوت تو افزائش نسل کا فیصلہ ہے جس پر عورت کو کوئی اختیار نہیں۔ اس کے علاوہ پاکستانی آبادی میں دنیا بھر کے برعکس، مردوں کا تناسب عورتوں سے زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بچیوں کی پیدائش پر افسوس اور ان کی طرف بے توجہی اور لاپرواہی زندگی کے پہلے ہی سال میں ان کی جان لے لیتی ہے۔ بچیوں اور عورتوں کو تعلیم اور دیگر پیداواری ہنر سے دور رکھا جاتا ہے۔ آزادی سے گھر کی چار دیواری سے باہر آنے جانے کی پابندی کی وجہ سے وہ اپنی علاقائی زبان کے علاوہ دوسری زبانوں سے ناواقف ہوتی ہیں۔ اس طرح جدید پیداواری نظام کے نقطہ نظر سے عورت کو جاہل کا خطاب دے کر مزید بے اختیار بنا دیا گیا ہے۔ پاکستان کے دیہی آبادی کا صوبائی تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ عورتوں اور مردوں کی خواندگی میں کتنا فرق پایا جاتا ہے: سندھ میں عورتیں ۱۳ فیصد اور مرد ۴۰ فیصد، بلوچستان میں عورتیں ۸ء۸ فیصد اور مرد ۲۸ فیصد، سرحد میں عورتیں ۱۶ء۷ فیصد اور مرد ۴۸ فیصد اور پنجاب میں عورتیں ۲۵ فیصد اور مرد ۵۱ فیصد خواندہ ہیں۔!

پدرشاہی اور سرمایہ داری نظام کے دہرے وار نے عورت کی خودی اور خوداعتمادی کو شدت سے مجروح کیا ہے۔ نتیجتاً وہ بھی اپنے آپ کو سماج کی نگاہوں سے پرکھتی ہے اور مردوں کی نسبت اپنے آپ کو کم تر سمجھتی ہے۔ وہ علم و حکمت جو اس نے اپنی بڑی بوڑھیوں سے سیکھا، اس کو بے بنیاد اور فرسودہ سمجھتی ہے۔

*چیلنج، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۲ء، صفحہ ۲ تا ۴.

آزاد تجارت اور صنعتی زراعت کے تحت نئے بیج، مصنوعی کھاد اور زہریلی کیڑے مار ادویات کو اول درجہ دے دیا گیا ہے۔ اس ٹیکنالوجی سے کچھ عرصے تک کے لیے فصل کی پیداوار میں کئی گنا اضافہ تو ہوتا ہے لیکن کچھ ہی عرصہ بعد یہ عمل رک جاتا ہے۔ جب تک کھاد کے مقدار میں مزید اضافہ نہیں کیا جاتا پیداوار میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ سبز انقلاب سے وقتی طور پر پیداوار میں جو اضافہ ہوا تھا اس کے عوض عورت نے بہت کچھ گنوایا ہے مثلاً گھرانے کے لیے اناج، سبزی، دودھ اور دیگر اشیاء میں شدت سے کمی، جنگلات، پانی اور مختلف قدرتی وسائل کا استحصال شدت سے ہوا کیونکہ یہ سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ حاصل کرنے کے لیے ایک قیمتی شئے میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ اب اناج خوراک کے لیے نہیں بلکہ زرمبادلہ کمانے کے لیے نقد آور فصل کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ اس کے علاوہ کیمیائی کھاد اور زہریلی دوا نے نہ صرف پانی، زمین اور مویشیوں کا چارہ زہر آلودہ کر دیا ہے بلکہ ماں کے دودھ تک کو اپنے لپیٹ میں لے لیا ہے۔ عورت اور مرد دونوں کے افزائش نسل کے نظام پر منفی اثر پڑا ہے اور اس طرح معذور بچوں کی پیدائش میں اضافہ ہوا ہے۔ جنگلات اور گھاس کی کمی نے گھرانے میں دودھ دینے والے جانوروں کی تعداد کم کر دی ہے اور تحفظ خوراک کو متاثر کیا ہے۔ اسی طرح جنگلات کے کٹنے سے بارشوں میں کمی واقع ہوئی ہے نتیجتاً صحراؤں کی وسعت میں اضافہ ہوا ہے۔ ماحولیات میں پائی جانے والی بربادی کی بنیادی وجہ سرمایہ دارانہ نظام کا غیر پائیدارانہ طریقہ پیداوار ہے۔ اس سلسلے میں جو دو اہم مسائل سامنے آتے ہیں وہ زرعی زمین کا بنجر ہونا اور صنعتی زراعت کے نتیجے میں بڑھتی ہوئی بے روزگاری ہے۔ ان سب اثرات کا گھمبیر اور دیرپا اثر دیہاتی آبادی کا شہر کی طرف منتقلی ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کا سب سے اہم مقصد پیداوار میں اضافہ کی تگ و دو ہے۔ اس کی نظر میں انسان کی حیثیت، پیداوار میں صرف ایک آلے کی طرح ہے۔ جتنی زیادہ انسانی آبادی بے روزگار ہوگی اس کے لیے فائدہ مند ہے، کیونکہ وہ مزدور کو کم سے کم اجرت پر اپنے فائدے کے لیے زیادہ سے زیادہ استعمال میں لا سکے گا۔ عورت جب شہر کی زندگی میں داخل ہوتی ہے تو بغیر تعلیم اور ہنر کے سستی سے سستی اجرت پر کام کرنے پر راضی ہو جاتی ہے۔ پاکستان میں اسکی کئی مثالیں موجود ہیں۔ بنگلہ دیش کی بگڑتی ہوئی معیشت نے، جس میں سرمایہ داری نظام کا قوی ہاتھ ہے، وہاں کی عورت کو مجبور کیا ہے کہ وہ اپنے ملک سے دوسرے ملکوں میں معاش کی تلاش میں نکلے۔ کراچی کے ساحلی علاقے سے شکار کیے گئے جھینگے کو کشتیوں اور ٹرالرز کے ذریعے صفائی کے لیے رات دو بجے کے قریب کچی آبادیوں میں واقع چھوٹے چھوٹے غیر رسمی گیراجوں میں لایا جاتا ہے، یہ کام بنگالی اور کچی آبادیوں میں رہنے والی غریب ترین مزدور عورتوں سے لیا جاتا ہے۔ رات کے تین بجے سے لیکر دن کے ۱۲ بجے تک پیڑیوں پر بیٹھ کر عورتیں یہ کام سرانجام دیتی ہیں۔ برف کی سیلیں اس اندھیرے اور گھٹے ہوئے ماحول میں رکھی ہوتی ہیں اور عورتیں شل ہوئی انگلیوں سے جھینگے کی صفائی کرتی ہیں۔ اس کام سے ان کی انگلیاں زخمی ہو جاتی ہیں لیکن معاشی مجبوری اور سرمائے کے استحصال کے آگے بے بس ہوتی ہیں۔ یہ عورتیں نہ صرف معاش کی تلاش میں کم اجرت پر کام کرتی ہیں بلکہ گھر چلانے کی پوری ذمہ داری بھی اپنے سر لیے ہوئی ہوتی ہے۔ کچی آبادیوں میں پانی یا گیس کی سہولت نہیں ہوتی۔ عورتیں اور بچیاں دور دور سے پانی بھر کر لاتی ہیں اور ایک غیر مانوس ماحول میں پدرشاہی نظام کے ظلم کو برداشت کرتی ہوئی کسی نہ کسی طرح اپنے اور اپنے گھرانہ کو چلاتی رہتی ہیں۔

یہ سمجھنا ضروری ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام نہ صرف جنگلات اور زرعی علاقوں کا استحصال کرتا ہے بلکہ زر کی تلاش میں سمندر میں پائے جانے والی قدرتی وسائل پر بھی بھرپور وار کرتا ہے۔ جھینگا بیرونی ممالک میں انتہائی مہنگے داموں فروخت ہوتا ہے لیکن ان عورتوں کو ۹ سے ۱۰ گھنٹے کی سخت محنت کے صلے میں مشکل سے ۸۰ سے ۱۰۰ روپے حاصل ہوتے ہیں۔ اس طرح ایک طرف ہم اپنے قدرتی وسائل اور غذا سرمایہ داروں کے ہاتھوں سستے داموں غیر ملکی کمپنیوں کو بیچ دیتے ہیں تو دوسری طرف سرمایہ کاری کو اپنے ملک میں فروغ دینے کے لیے سستا مزدور فراہم کرتے ہیں۔ ان حالات میں مزدور عورت ایک کم تر زندگی گزارنے پر مجبور کر دی جاتی ہے۔ گلوبلائزیشن کے حامیوں کے لیے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ سرمایہ دنیا بھر میں ایسے

حالات پیدا کر رہا ہے کہ مزدور مرد و عورت اپنے علاقے چھوڑ کر معاش کی تلاش میں سخت تکالیف برداشت کرتے ہوئے دوسرے علاقوں کا رخ کریں۔

پاکستان کے کئی شہروں میں کثرت سے کارخانے پائے جاتے ہیں۔ان کی پیداوار کے نتیجے میں جو زہریلا کیمیائی فضلہ جمع ہوتا ہے اس کو دریاؤں اور سمندر میں پھینک دیا جاتا ہے۔اس عمل سے دریاؤں اور سمندر میں پائی جانے والی زندگی پر کئی گنا منفی اثر پڑا ہے۔اس کے علاوہ سندھ اور بلوچستان کے علاقوں میں بڑے بڑے ٹرالرز اور پانی کے جہاز سمندری پانی کو آلودہ کرتے ہیں۔کراچی کے قریب سمندری پانی میں ڈی ڈی ٹی، پی سی بی اور دوسرا زہریلا مواد پایا جاتا ہے جس سے نہ صرف پانی زہریلا ہوتا ہے بلکہ اس میں بسنے والی مچھلی بھی۔[۲] خاص طور پر وہ مچھیرے اور ان کے گھرانے جو سمندر سے اپنی خوراک حاصل کرتے ہیں، مچھلی پکڑنے میں مشکل ہی سے کامیاب ہوتے ہیں کیونکہ غیر ملکی جہاز (ٹرالرز) بڑے بڑے جال استعمال کرتے ہیں جس سے مچھلی بڑی تعداد میں شکار کی جاتی ہے جس کی وجہ سے مچھلی کم ہوتی جا رہی ہے۔اس کے علاوہ جو مچھلی پکڑی جاتی ہے، اس میں بھی زہریلا مواد ہوتا ہے اور یہی مچھلی خوراک کا حصہ بنتی ہے۔ہمارے ملک کے ساحلی علاقوں کی کئی آبادیاں صنعتی ترقی اور مچھلیوں کی برآمد کی وجہ سے شدید بحران کا سامنا کر رہی ہیں۔سندھ کے ساحلی سمندر میں تیمر کے جنگلات کی تباہ کاری عام ہے اور اس کے اردگرد بسنے والی آبادیوں کے ہزاروں افراد ہجرت پر مجبور ہیں جس کی وجہ سے یہ بستیاں غیر آباد ہوتی جا رہی ہیں۔[۳]

شہر کے صنعتی علاقوں میں واقع کچی آبادیوں میں فضلہ اور گند کے علاوہ کارخانوں سے نکلنے والا دھواں وہاں کے باسیوں کے لیے سخت نقصان دہ ہے۔خیال کیا جاتا ہے کہ کراچی میں روزانہ تقریباً ۱۰,۰۰۰ میٹرک ٹن فالتو کچرا ٹھوس شکل میں جمع ہوتا ہے جس میں سے ۶۰ سے ۷۰ فیصد کراچی کی سڑکوں پر پایا جاتا ہے۔[۴] یہی حال لاہور سمیت دوسرے بڑے شہروں کا بھی ہے۔ماحولیاتی آلودگی کے بارے میں یہ تصور کیا جاتا ہے کہ یہ مرد کی نسبت عورت پر زیادہ منفی اثرات مرتب کرتی ہے کیونکہ عورتوں کی جلد مردوں سے زیادہ نرم اور حساس ہوتی ہے۔ایک بین الاقوامی طبی رسالہ (لین سیٹ) کے مطابق ایسی عورتیں جو خطرناک فضلہ سے تین کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہوں ان میں سے ۴۰ فیصد کو یہ خطرہ لاحق ہوسکتا ہے کہ ان سے پیدا ہونے والی اولاد ذہنی پسماندگی کا شکار ہوں۔[۵] مثلاً ایک بیماری جسے ڈاؤن سینڈروم کہا جاتا ہے، میں مبتلا لوگوں کی ذہنی قابلیت عام لوگوں سے کئی درجہ کم ہوتی ہے، یہ بیماری بھی ان علاقوں میں ہوسکتی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ماحولیاتی آلودگی سے پیدا ہونے والی بیماریوں کا بوجھ بھی عورت کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔شہر اور دیہات دونوں میں عورت ہی ذہنی اور جسمانی بیمار افراد کی دیکھ بھال کا ذمہ اٹھائے ہوئے ہوتی ہے۔ایسے افراد کی دیکھ بھال نہ صرف ذہنی پریشانی کا باعث ہوتی ہے بلکہ جسمانی صحت پر بھی منفی اثرات مرتب کرنے کا باعث بنتی ہے۔جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے عورت پاکستانی معاشرے میں پدرشاہی نظام کے جال میں پھنسی ہوئی ہے جہاں ظلم اور استحصال کی بنیاد پر اس کو غذا، تعلیم اور خودمختاری میں سے کوئی بھی حق حاصل نہیں، وہاں ماحولیاتی آلودگی یقیناً شہری اور دیہی عورت کے لیے ایک اور بوجھ ہے۔

پاکستان میں ماحولیات کے حوالے سے شہروں میں کیڑے مار ادویات کی ذخیرہ اندوزی ایک تشویش ناک مسئلہ ہے۔کہا جاتا ہے کہ پاکستان میں پرانی اور آج کل کے دور میں استعمال نہ ہونے والے کیڑے مار ادویات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔اس ۱۷۰۰ سے ۲۰۰۰ ٹن کیڑے مار ادویات کے ذخیرے میں دو تہائی ذخیرہ نہایت ہی خطرناک کیڑے مار ادویات کا ہے۔[۶] چونکہ زہریلے ادویات کے گودام شہری آبادی میں پائے جاتے ہیں اس لیے زیادہ خطرناک ہیں۔یہ گودام زیادہ تر کچی آبادیوں میں موجود ہیں جہاں پر آبادی گنجان ہوتی ہے۔کچی آبادیوں میں عورتیں اور بچے ہر وقت موجود ہوتے ہیں جبکہ مرد کام کے لیے باہر جاتے ہیں۔اس طرح ان کیڑے مار ادویات کا اثر بچوں اور عورتوں پر ہونے کے زیادہ امکانات ہیں۔

صنعتی ترقی کا شہروں پر ایک اور منفی اثر گاڑیوں اور رکشوں کی کثرت کی وجہ سے بھی پڑا ہے، جن سے نکلنے والے دھوئیں سے خون میں زہریلا مواد (سیسہ) خطرناک حد تک پہنچ جاتا ہے۔اس کا سب سے خطرناک اثر بچے اور بچیوں پر پڑا ہے۔آغا خان یونیورسٹی کے ایک سروے کے مطابق ۴۰۰ بچوں میں سے ۳۲۲ کے خون میں سیسہ کی مقدار مقررہ حد سے تجاوز کر چکی ہے۔[۷] ان بچوں کی عمریں تین سے پانچ سال کے درمیان تھیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ چھوٹے بچے ماحولیاتی آلودگی سے متاثر ہو کر سخت نقصان اٹھاتے ہیں۔

اس طرح سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام اپنے ساتھ زیادہ سے زیادہ پیداواری صلاحیت تو ضرور لاتا ہے لیکن اس صلاحیت کو قدرتی وسائل اور جانداروں کے استحصال کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔مزدور طبقہ اس استحصال میں سب سے زیادہ پستا ہے۔مزدور عورت چونکہ دو نظاموں (یعنی پدرشاہی اور سرمایہ داری) کی چکی میں پیسی ہوئی ہے اس لیے ماحولیاتی بحران سے پیدا ہونے والے مسائل کا سب سے زیادہ سامنا بھی اسی کو کرنا پڑ رہا ہے۔جب تک سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ نہیں ہوگا ماحولیات اور انسانی آبادیوں کا استحصال جاری رہے گا۔

حوالاجات:

۱۔ پاکستان اسٹاٹیسٹیکل ایئر بک، ۲۰۰۱ء۔
۲۔ عامر کبیر، مرین پلوشن ایلونگ دا کوسٹ لائن۔ڈان، ۱۴، جنوری ۲۰۰۲ء۔
۳۔ عامر کبیر، انڈس ڈیلٹا انڈر تھریٹ بائی ایڈوانسینگ سی، دی نیوز، ۳۰، جولائی ۲۰۰۱ء۔
۴۔ ثمینہ اقبال، انوائرنمنٹ اپ ڈیٹ، ڈان، ۱۰، اپریل ۲۰۰۲ء۔
۵۔ ثمینہ اقبال، انوائرنمنٹ اپ ڈیٹ، ڈان، ۲۶، فروری ۲۰۰۲ء۔
۶۔ جی ٹی زی، انوائرنمنٹل پروٹیکشن ایجنسی، گورنمنٹ آف این ڈبلیو ایف پی، سیف گارڈنگ اینڈ ڈسپوزل آبسولیٹ پیسٹی سائیڈز ان این ڈبلیو ایف پی ر پاکستان، پشاور، جی ٹی سی، ۱۹۹۹ء۔
۷۔ مبینہ اگبوٹ والا، الارمنگ لیڈ لیولز ان کراچی ایئر، ڈان، ہیلتھ اینڈ انوائرنمنٹ، ۸، اگست ۲۰۰۱ء۔

یہ مضمون سوشل ڈیولپمنٹ پالیسی انسٹی ٹیوٹ (ایس ڈی پی آئی) کی تیار کردہ ''اسٹیٹ آف دی انوائرنمنٹ رپورٹ'' میں شائع کردہ ''عورت اور ماحولیات'' کے حصے کا خلاصہ ہے۔

پاکستان میں زرعی شعبہ سے وابستہ مزدور بچے اور سرمایہ دارانہ نظام کے مظالم!*

خائستہ محمد

مارکس کے مطابق سرمایہ دارانہ نظام مزدور کے استحصال پر قائم ہے۔ یہ نظام مزدور سے لمبے اوقات کار پر کام کروا کر اور کم اجرت دے کر منافع اکھٹا کرتا ہے۔[1] اس نظام میں جب مرد مزدور کو اتنی بھی اجرت نہیں ملتی کہ وہ اپنے گھر بار کی ضروریات کو پورا کرے تو عورتیں اور بچے بھی اس نظام کے استحصال کا نشانہ بنتے ہیں۔

پاکستان میں اس وقت جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام دونوں ساتھ ساتھ رائج ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مزدور اور خاص کر مزدور کسان کا شدید استحصال ہو رہا ہے۔ اگر اس حوالے سے ہم دیہی آبادی کا تجزیہ کریں تو نظر آتا ہے کہ مزدور کسان مرد اور عورت کے علاوہ ان کے بچے بھی سخت کام میں لگے ہوئے ہیں۔

اس وقت پاکستان کی آبادی ۱۴۰ ملین کے لگ بھگ ہے جس میں سے ۷۰ ملین بچے ہیں جن کی عمریں ۱۸ سال سے کم ہیں (ٹیبل ۱)۔[2]

ٹیبل ۱

بچوں کی کل تعداد	۵ سال سے کم عمر بچے	۵-۱۸ سال کے بچے	اسکول جانے والے بچے	اسکول نہ جانے والے مزدور بچے
۷۰ ملین (۱۰۰٪)	۲۴ ملین (۳۴٪)	۴۶ ملین (۶۶٪)	۲۳ ملین (۳۳٪)	۲۳ ملین سے زائد (۳۳٪+)

مندرجہ بالا ٹیبل پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ ہماری آبادی کا نصف حصہ بچوں پر مشتمل ہے جبکہ مجموعی آبادی کا تقریباً ۶۵ فیصد آبادی دیہات میں آباد ہے۔ اس طرح اندازاً ۷۰ ملین بچوں میں سے کم از کم ۵۷ فیصد بچوں کا تعلق دیہات سے ہے اور یقیناً معاشی حوالے سے انہی علاقوں میں بچوں کو اسکول جانے کے سب سے کم مواقع حاصل ہیں۔ اسی طرح اگر ہم شہری بچوں کا جائزہ لیتے ہیں تو کراچی جیسے شہر کی نصف فیصد آبادی کچی بستیوں میں رہتی ہے۔ جہاں مزدور زیادہ سے زیادہ ۴۰۰۰ ہزار روپے ماہوار کما سکتا ہے۔ گھرانے کی افرادی تعداد اوسطاً ۵ء۶ افراد بتائی جاتی ہے اس طرح یہ رقم ایک پاکستانی گھرانے کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ناکافی ہے۔ دیہات میں گھرانے کی شرح ۷ افراد فی گھرانہ ہے۔ ان حالات میں مزدور اور مزدور کسان طبقے سے تعلق رکھنے والے بچوں کو پیٹ بھرنے کے لیے مجبوراً محنت و مشقت کرنی پڑتی ہے۔

مزدور بچے مختلف شعبوں میں کام کرتے ہیں جس میں زرعی شعبہ سے لیکر آٹو موبائل، اینٹوں کے بھٹے سے لیکر دکانوں میں مزدوری شامل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گزشتہ ایک دہائی سے مزدور بچے یا ''چائیلڈ لیبر'' پر بے تحاشہ بحث و مباحثہ ہو رہا ہے۔ لیکن اس بحث کے نتیجے میں نہ پاکستان اور نہ ہی کسی اور ملک میں اس ظلم سے چھٹکارا ممکن ہو سکا ہے۔ دیکھنے کی ضرورت یہ ہے کہ وہ کونسی وجوہات ہیں جن کی وجہ سے بچوں کو شہر و دیہات میں مشقت پر مجبور کیا جاتا ہے؟ بچوں کا استحصال جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام میں پنہاں ہے۔ فرق یہ ہے کہ جاگیرداری نظام میں زمیندار بلا خوف و خطر بچوں سے کھلے عام بلا معاوضہ مشقت لیتا ہے لیکن سرمایہ داری میں بچوں کی مشقت پر شدید تنقید اور مخالفت کی جاتی ہے۔ لیکن اسی نظام میں مزدوروں پر ہونے والے استحصال، جو کہ بچوں کی مزدوری کی بنیادی وجہ ہے، کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اسی نظام میں مزدور کو پکی نوکری سے ہٹا کر دہاڑی، کنٹریکٹ اور پیس ریٹ پر کام کرنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ نجکاری کے نام پر مزدوروں کو بے روزگار کر دیا گیا ہے یا بنیادی ضروریات سے بھی کم حاصل کرنے والی اجرت پر رکھا جاتا ہے۔ اس طرح شہروں میں اب برائے نام مزدوری موجود ہے لیکن سونے پہ سہاگہ دنیا کے ہر براعظم میں سرمایہ داری نظام کی کامیابیوں کے چرچے ہیں!

دیہات میں جاگیردار اور سرمایہ دار کی ملی بھگت سے ایک طرف پورے خاندان سے کام لیا جاتا ہے اور دوسری طرف جدید مشینوں کے استعمال سے مزدور کسان کی روزی چھینی جا رہی ہے۔ ان حالات میں بچے مزدوری نہیں کریں گے تو اور کیا کریں

* چیلنج، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۳ء، صفحہ ۲ تا ۴۔

گے؟ پہلے جاگیردار ہاری کو زمینوں پر آدھے حصے کا حقدار بناتا تھا اور اب اس کو صرف تیسرے حصے تک محدود کر دیا گیا ہے۔

مزدور کسان بچوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ۲۵۰ بچوں سے فوکس گروپس کے ذریعے معلومات حاصل کی گئی۔ یہ بچے چھ غیر رسمی اسکولوں میں بنیادی تعلیم کے لیے آتے ہیں۔ ان بچوں میں ۷۰ بچیاں اور ۱۸۰ بچے شامل تھے۔ ۲۵۰ بچوں میں سے ۹۴ فیصد بچے ایسے تھے جو کہ زمینوں پر کام کرتے تھے اور باقی ۶ فیصد بچے غیر زرعی شعبے میں کام کرتے پائے گئے دوسرے لفظوں میں ۱۰۰ فیصد بچے مزدوری کرتے تھے۔ یہ بچے لوہار کی دکان، ٹائر پنکچر والے کے پاس اور ورکشاپوں، پھل اور ریڑھی والے کے پاس کام کرتے ہیں۔

بچوں کا خیال ہے کہ زمینوں پر سب سے زیادہ کام بچے ہی کرتے ہیں کیونکہ بڑے اکثر بیٹھ کر بچوں کو طریقے بتاتے ہیں اور ہدایات دیتے رہتے ہیں کہ کام جلدی کرو۔ بچوں سے ان کی غذا کے بارے میں معلوم کیا گیا تو انہوں نے بتایا کہ کبھی کبھی تو روٹی کے ساتھ سالن کھانے کو ملتا ہے جبکہ بیشتر اوقات صرف پیاز اور مرچ وغیرہ کے ساتھ روٹی کھائی جاتی ہے۔ جب بچوں سے دودھ کے حوالے سے بات کی گئی تو ایک بچے نے کہا کہ ''گھر والے ہمیں دودھ پینے کو نہیں دیتے بلکہ بازاروں میں بیچ دیتے ہیں اور دودھ کو بھی ہم بچے ہی اپنے سروں پر رکھ کر بازار لے کر جاتے ہیں۔ اس کے بدلے جو رقم ملتی ہے اس سے گھر کے لیے چینی، چائے، آٹا وغیرہ خریدتے ہیں۔''

بچے اور بچیاں صبح اٹھتے ہی کھیتوں پر کام کرنے کے غرض سے روانہ کر دیے جاتے ہیں۔ کھیتوں میں کام کے علاوہ کپڑے دھونا، جانوروں کو سنبھالنا، ان کو پانی پلانا، نہلانا، گھاس کاٹ کر لانا یہ تمام ذمہ داریاں بچوں پر ڈال دی جاتی ہیں۔ بچوں نے جانوروں کے دیکھ بھال کے حوالے سے بتایا کہ جانوروں کو (بھینس، بکریاں، گائے، اونٹ، گدھے) پالنا ان کی خاص ذمہ داری ہے۔ یہ عام مشاہدہ ہے کہ جگہ جگہ بھینسوں کا ریوڑ ہو یا بکریوں کا ۲، ۳ بچے ساتھ ضرور ہوتے ہیں۔

گھر کے کام کے حوالے سے بچوں نے بتایا کہ ایندھن کی ضروریات پوری کرنے کے لیے لکڑیاں کاٹنا اور انہیں سر پر رکھ کر ایک سے دو کلو میٹر کا فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ بچیوں نے کہا کہ ہم صبح سویرے اٹھ کر سب سے پہلے گھر کی صفائی کرتے ہیں۔ اس کے بعد روٹی اور چائے کا انتظام کرتے ہیں، بستر اٹھا کر رکھتے ہیں اور پھر والدین کے ساتھ کھیتوں پر جاتے ہیں۔ تیار کھانے کو کھیت میں گھر والوں تک پہنچانا بھی بچوں کی ذمہ داری ہے۔ کھانے پکانے میں مدد اور چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال اکثر گھر کی بچیوں کے حوالے کر دی جاتی ہے۔ یہ تمام کام بچوں سے بلا معاوضہ لیا جاتا ہے۔

کھیتوں پر کام کے حوالے سے بچوں نے بتایا کہ وہ ہر فصل گنا، کپاس، پیاز، مرچ، گندم، سورج مکھی، بھنڈی، ٹنڈا، گاجر یا چاول پر بڑوں کے ساتھ مل کر زمین کو نرم کرتے ہیں، گھاس پھوس ہٹاتے ہیں اور فصلوں کو پانی بھی دیتے ہیں۔ بچوں کے مطابق سب سے مشکل کام مرچ کی چنائی ہے۔ اس سے نہ صرف ہاتھوں میں جلن ہوتی ہے بلکہ فصل کو جھک کر چننا پڑتا ہے جس سے کمر میں بھی درد رہتا ہے۔

دیہات میں زرعی شعبے کے ہر حصے میں بچے مزدوری کرتے نظر آتے ہیں۔ جہاں انہیں انتہائی کم معاوضہ دیا جاتا ہے۔ مرچ، بھنڈی اور ٹنڈے کی فصلوں کو اتارنے پر فی بوری ۲۵ روپے ملتے ہیں۔ پیاز و کپاس دونوں کے بیج لگانے کے فی ایکڑ ۴۰۰ روپے ملتے ہیں اور کپاس کی چنائی فی من ۸۰ سے ۱۰۰ روپے ملتے ہیں۔ پیاز کی بوری پر ۳۰ روپے ملتے ہیں لیکن پیاز کو سکھانے میں ۳ دن لگتے ہیں اور گنے کی کٹائی پر فی من ۳ روپے ملتے ہیں جس میں کٹائی سے لے کر ٹرک کی بھرائی تک کا کام شامل ہے۔ اگر ٹرک راستے میں الٹ جائے تو اسی رقم میں دوبارہ بھرنا پڑتا ہے۔ گندم کی کٹائی پر فی ایکڑ ڈیڑھ من گندم بطور معاوضہ ملتا ہے۔

بچوں نے چاول کی فصل کے بارے میں بتایا کہ وہ والدین کے ساتھ دور دراز علاقوں میں جا کر چاول کی کٹائی میں حصہ لیتے ہیں۔ یہ ایک تکلیف دہ، مشکل کام ہے کیونکہ فصل پانی کے اندر کھڑے ہو کر کاٹنی پڑتی ہے اس کے علاوہ جامن، آم اور کیلے کے پھل کو اتارنے کے لیے دوسرے علاقوں میں جانا پڑتا ہے۔ اس کام کی دہاڑی ۵۰ روپے روزانہ ہے۔

بچے فصلوں پر کیڑے مار ادویات کا اسپرے بھی کرتے ہیں جو کہ ان کے لیے انتہائی مضر صحت ہے۔ بچوں کی جلد نرم ہوتی ہے اس کے علاوہ ان کا قد کم ہوتا ہے۔ اس وجہ سے کیڑے مار دوا بچوں کی صحت کے لیے سخت نقصان دہ ہے۔

ممتاز تاریخ داں ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں کہ سندھ کے چند بڑے جاگیرداروں کے نجی جیلوں میں ہاری قید ہیں جن میں بچے بھی شامل ہیں۔ دن رات کھیتوں پر سخت کام کے عوض صرف ڈیڑھ کلو آٹا فی خاندان دیا جاتا ہے۔[۳] اگر دیکھا جائے تو ہمارے دیہاتوں میں بسنے والے ایسے خاندان بھی ہیں جنہیں انتہائی بھوک و افلاس کا سامنا ہے اور پورا گھرانہ مل کر بھی ماہانہ اتنا نہیں کما سکتا جتنا کہ امیر طبقے سے تعلق رکھنے والا کوئی فرد واحد ہوٹل میں ایک وقت کے کھانے کا بل ادا کرتا ہے۔ موجودہ حالات میں ایسے لاکھوں لوگ موجود ہیں جنہوں نے تمام عمر کبھی بھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں

کھایا۔ یہاں یہ امر قابل افسوس ہے کہ جو دن رات محنت کرے وہ صرف مرچ یا پیاز سے سوکھی روٹی کھائے اور جو محنت نہ کرے بیٹھے بٹھائے اعلیٰ ہوٹلوں میں مزدور کی محنت سے کمائے ہوئے سرمائے پر عیش اڑائے۔

پاکستان کا زرعی شعبہ ملکی پیداوار کا اہم حصہ فراہم کرتا ہے اور اس پیداوار میں بچے اور بچیاں بھی شریک ہیں۔ ہمارے حکمرانوں کو شائد یہ سوچنے کا موقع نہیں ملا ہے کہ اس پیداوار پر مزدور بچوں کا کیا حق ہے؟ جو لاکھوں ڈالرز زرمبادلہ کمایا جاتا ہے اس میں سے مزدور بچوں کے حال اور مستقبل کے لیے کیا خرچ کیا جاتا ہے؟ پاکستان کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۲۳ ملین یا ۳۳ فیصد سے زائد بچے اسکول نہیں جاتے اور نہ ہی ان بچوں کے لیے صحت، بہتر غذا یا صاف ستھرے ماحول میں رہنے کی سہولتیں میسر ہیں۔ پاکستان نے کنونشن آن چائلڈ رائٹس پر دستخط کیا ہوا ہے اور اس مسودے کے تحت غذا، گھر، تعلیم، صحت، تفریح اور دیگر انسانی حقوق ان بچوں تک پہنچانے کی ذمہ داری تسلیم کر لی ہے۔ اقوام متحدہ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت کئی خوبصورت مسودے تو تیار کروا دیتا ہے لیکن ان کو تکمیل تک پہنچانا یقیناً اس کا مقصد نہیں ہوتا۔ جن بچوں سے راقم نے انٹرویو کیا ہے ان ۲۵۰ بچوں میں سے کوئی بھی حکومت کے اسکول میں نہیں پڑھتا۔ پڑھنا تو دور کی بات ان کو گھنٹہ دو گھنٹہ آرام کرنے کا بھی موقع نہیں ملتا اور آخر میں وہی سوکھی روٹی، جراثیم اور زہریلی دوا سے آلودہ پانی پر زندگی گزر جاتی ہے۔

والدین بچوں کی بہتر زندگی کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ یہ صرف نظام کا الٹا پہیہ ہے جو کہ وہ بچوں سے محنت مزدوری کرانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ضرورت سے زیادہ جسمانی محنت سے بچوں کو جسمانی اور ذہنی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ چھوٹی عمر میں بچوں کو ذہنی افزائش کے مواقع فراہم کرنا چاہیے، تاکہ بچہ بہترین تعلیم حاصل کرے اور اپنی صلاحیت کے بہتر سے بہتر معیار کو پہنچ سکے۔ یہ عجب مذاق ہے کہ خود جاگیردار اور سرمایہ دار جانتے بوجھتے بچوں کے استحصال کی راہیں مضبوط کرتا ہے لیکن معاشرہ ان کو ذمہ دار نہیں ٹھہراتا بلکہ اس کو سماجی برائی کہہ کر انہیں بری الذمہ کر دیتا ہے۔ مزدور بچے دراصل ایک استحصال پسند معاشی نظام کا نتیجہ ہیں اور معاشرے سے اس برائی کا خاتمہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ جاگیرداری اور سرمایہ داری جیسے استحصالی نظام کو ختم نہ کر دیا جائے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۳۵ سے ۴۰ فیصد تک عوام غربت کی لکیر سے بھی نیچے زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ یقیناً یہ بے رحم طرز زندگی عوام نہ تو خود سے اپناتی ہے اور نہ ہی ان کے مقدر کا نتیجہ ہے۔ دراصل یہ سرمایہ دارانہ پالیسیوں کا نتیجہ ہے جس کے تحت آج غذا، تعلیم، صحت، روزگار اور دیگر عوامی سہولیات کی فراہمی صرف نجی شعبے پر ڈال دی جاتی ہے۔ ہماری حکومتیں عالمی مالیاتی اداروں سے مخصوص شرائط پر قرضے وصول کرتی ہیں جنہیں اسٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ پروگرام (SAP) کہا جاتا ہے۔

عالمی مالیاتی اداروں سے قرض لیتے وقت ہماری حکومتیں اشرافیہ کے فوائد کو مدنظر رکھتے ہوئے عوام دشمن شرائط تسلیم کر لیتی ہیں۔ گزشتہ سالوں میں ان قرضہ جات کے بدلے خاص کر کے زراعت سے مراعات کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سرکاری شعبوں کو نجکاری کے ذریعے نجی شعبوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ انہی مالیاتی اداروں کے کہنے پر گیس، بجلی اور تیل کی قیمت میں کئی گنا اضافہ کر دیا گیا ہے اور ہر سال سینکڑوں مزدوروں کو نوکری سے نکالا جا رہا ہے جو باقی مزدور رہ گئے ہیں ان کے لیے مراعات کا خاتمہ کیا جا رہا ہے۔ اس صورت حال میں دیہی آبادی کے باسی اپنے بچوں کو کیسے اسکول میں داخل کروا سکتے ہیں؟ ان بچوں کے لیے بہترین صحت اور تفریح کے مواقع کیوں کر ممکن ہیں؟ کیا ہم واقعی بچوں کی مشقت کے خاتمہ کے لیے سنجیدہ ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ انسانی حقوق کی تحریک ایک تنقیدی جائزہ، روبینہ سہگل، صفحہ ۲۰۔
۲۔ دی اسٹیٹ آف پاکستان چلڈرن، ۲۰۰۲ء، صفحہ ۴۱۔
۳۔ جاگیرداری، ڈاکٹر مبارک علی، صفحہ ۲۳۶۔

سامراجیت، آزاد تجارت اور قحط*

تلخیص و ترجمہ: عذرا طلعت سعید

ایڈیٹر نوٹ: چیلنج کے پچھلے شمارے میں مائیک ڈیوس کی کتاب ''لیٹ وکٹورین ہولوکاسٹس: النینو فیمینز اینڈ دی میکنگ آف دی تھرڈ ورلڈ'' کے دیباچہ، نوٹ برائے وضاحت اور پہلے باب کے کچھ حصوں کا ترجمہ پیش کیا گیا تھا۔ موجودہ شمارے میں دوسرے باب کے کچھ حصوں کا ترجمہ حاضر ہے۔ مائیک ڈیوس نے ۱۹ویں صدی کے آخر میں آنے والے قحط کو سامراجی قوتوں کی سرمایہ دارانہ پالیسیوں سے جوڑ کر واضح کیا ہے کہ بھوک، قحط اور بیماری، موسمی بدحالی سے زیادہ سرمایہ داری نظام سے جڑے ہوئے ہیں۔ خوراک ایک بنیادی انسانی حق ہے اور ڈیوس کی تحقیق کھل کر واضح کرتی ہے کہ ہر علاقے کے باسیوں کو اپنی خوراک کی ضروریات کی حفاظت کے لیے حق خود ارادیت حاصل ہونی چاہیے۔ یقیناً زراعت کو سرمایہ داری نظام کے حوالے کرنے کا نتیجہ تباہ کاری ہے۔

۱۸۷۶ء میں برطانوی راج کی تجارتی پالیسیوں اور شدید خشک سالی کے نتیجے میں آنے والا قحط صرف ہندوستان تک محدود نہیں رہا۔ ۱۸۷۶ء-۱۸۷۸ء کے دورانیہ میں سیلون (سری لنکا)، چین، کوریا، جاوا، بورنیو، مصر، الجیریا، مراکش اور برازیل تک سے خشک سالی، بھوک اور ہیضہ سے پیدا ہونے والی شدید تباہ کاریوں کی خبریں آنے لگیں۔[۱]

عالمی سطح پر کاروباری مندی کی وجہ سے خشک سالی کے اثرات مزید سنگین ہو گئے۔ امریکہ میں ریل گاڑی کی صنعت سے جڑی ہوئی سٹے بازی میں بحران پیدا ہوا اور اس طرح وال اسٹریٹ میں نام نہاد سرمائے کے خاتمے سے مانچسٹر کاٹن ایکسچینج کی قیمتوں میں شدید کمی اور کئی صنعتی مراکز میں بے روزگاری بڑھی۔ نتیجتاً عالمی تجارت پر منفی اثرات پڑے اور خاص کر قیمتوں میں کمی واقع ہوئی۔[۲] دنیا بھر کے شہروں میں مداریئی خطوں (ٹراپیکل) اور نو آبادیات سے آنے والی چیدہ چیدہ اشیاء کی مانگ میں کمی واقع ہوئی لیکن اس کے ساتھ ساتھ زرعی اشیاء کے برآمدات میں بھی اضافہ ہوا کیونکہ ریل گاڑی کے نظام کے پھیلاؤ سے امریکہ اور روس میں زرعی پیداواری علاقوں تک رسائی بڑھ گئی۔ مزید یہ کہ نہر سویز کے بننے سے یورپ اور ایشیاء کے درمیان فاصلہ بہت کم ہو گیا اور عالمی تجارت کو مزید فروغ حاصل ہوا۔ ان سارے عوامل کے مجموعی اثر سے منڈیوں میں زرعی اشیاء کا مقابلہ سخت ہو گیا اور زرعی آمدنی میں شدید کمی واقع ہوئی۔ عالمی منڈی میں کپاس، چاول، تمباکو اور چینی کی قیمت اپنی پیداواری لاگت کی حد تک گر گئی اور کئی جگہوں پر تو اس سے بھی کم ہو گئی۔[۳]

اوپر بیان کیے گئے حالات کی بناء پر کئی کروڑ کسان، جو حال ہی میں عالمی منڈی کے جال میں پھنسے تھے، دور دراز رونما ہونے والے معاشی بحران کا نشانہ بنے۔ اس کی اہم وجہ یہ تھی کہ ان علاقوں میں روایتی کھیتی باڑی کسان آبادیوں کے روزمرہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کی جاتی تھی۔ ان آبادیوں میں جب سامراجی طاقتوں کے دباؤ پر روایتی کھیتی باڑی سے ہٹ کر عالمی منڈی کے لیے پیداوار شروع کی گئی تو عالمی معیشت میں بحران کے ہاتھوں کسان اپنے آپ کو سنبھال نہ سکے۔ اس بحران کی زد میں مغربی ہندوستان، مصر، الجیریا، برازیل، فیجی اور آسٹریلیا کے علاقے بھی شامل تھے۔ ان علاقوں میں امریکی خانہ جنگی کی وجہ سے کپاس کی پیداوار وسیع پیمانے پر ہوتی رہی اور کافی فائدہ ہوا، لیکن اس دورانیہ میں کسان روایتی کھیتی باڑی سے دور ہو چکے تھے۔ خانہ جنگی کے خاتمہ کے بعد امریکہ میں کپاس کی پیداوار دوبارہ شروع ہونے سے دنیا بھر میں لاکھوں چھوٹے کسانوں کو قرضے اور غربت کا سامنا کرنا پڑا۔[۴]

برازیل، فلپائن اور ایسٹ انڈیا میں گنے کے کاشتکار چینی کی گرتی ہوئی قیمتوں اور یورپ میں چقندر (جو کہ چینی بنانے کا ایک اور ذریعہ ہے) کی کاشت کی وجہ سے عالمی منڈی میں سخت مشکلات کا سامنا کر رہے تھے۔ اسی طرح چین میں چائے کاشت کرنے والے کسانوں کو آسام اور سیلون (سری لنکا) سے آنے والی چائے اور جاپان سے آنے والے ریشم سے مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا۔ ان سب تبدیلیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۸۷۵ء تک عالمی سطح پر زرعی آبادیوں میں بڑے پیمانے پر بے اطمنانی اور خلفشار شروع ہو چکا تھا۔

چین میں ۱۸۷۶ء سے ہی خشک سالی کے سنگین نتائج نظر آنے لگے تھے۔ شین ڈونگ، چین میں ۱۸۷۶ء سے پہلے ہی شدید خشک سالی تھی۔ مزدور کسان گھاس اور ٹہنیوں سے بنے ہوئے اپنے ہی گھر اکھاڑ کر کھانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ حالات کی سنگینی اس قدر تھی کہ تن سے کپڑے اور بچوں کو بھی بیچا گیا۔[۵]

خشک سالی کے آغاز میں چینی اشرافیہ کو نشانہ بنانے والی کئی مزاحمتیں منظر عام پر آئیں۔ مزدور کسان عورتوں نے مل کر بے ایمان مجسٹریٹ اور لالچی اشرافیہ کے خلاف مزاحمتی اقدامات اٹھائے۔ مثلاً عورتوں کے گروہ نے دولت مند افراد کے باورچی خانوں میں گھس کر کھانا پکا کر کھایا اور پھر اگلے کھانے کا انتظام کرنے کے لیے کسی اور کے گھر کا رخ کیا۔ ایک دوسرے علاقے میں ۱۰۰ عورتوں نے باورچی خانے سے گوشت کاٹنے والے چاقو اور سبزی کاٹنے کے تختے لیکر مجسٹریٹ کے دفتر کے سامنے دھرنا دیا۔ جب مجسٹریٹ باہر آیا تو ایک عورت نے بلند آواز میں کہا ''وہ مجسٹریٹ جو غریبوں کا پیسہ کھاتا ہے، جب کہ لوگ قحط سے مر رہے ہیں، اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے چاہیے۔ ساری عورتوں نے اس عورت کے ساتھ مل کر اپنے اپنے تختوں پر چاقو سے کاٹنے کا مظاہرہ کرتے ہوئے مل کر نعرہ لگایا ''جو غریبوں کا پیسہ ہڑپ کرتا ہے، اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے چاہیے۔[۶]''

* چیلینج، اپریل تا جون ۲۰۰۳ء، صفحہ ۹ تا ۱۰.

اس طرح کی جنگجو مزاحمتیں خشک سالی کے آغاز میں ہی نظر آئیں۔ جوں جوں خشک سالی بڑھتی گئی، ضلع شین ڈونگ کے مکین یا تو قحط کی وجہ سے جان سے ہاتھ دھو بیٹھے یا پھر علاقہ چھوڑ کر چلے گئے۔ صرف ایک ہی علاقے میں ایک لاکھ سے زائد لوگ ٹھیکیداروں کے ہاتھ فروخت کیے گئے۔ چینی بادشاہت امداد تقسیم کرنے میں ناکام رہی تھی۔ بادشاہ نے زائد آمدنی کو وسطی ایشیاء میں اپنی بادشاہت پھیلانے کے لیے کی گئی جنگوں، ساحلی قلعہ اور اسلحہ سازی میں استعمال کرلیا تھا۔ اوسطاً ایک بڑے ضلع میں ایک سے دو لاکھ جانیں خشک سالی کی نظر ہوئیں اور چھوٹے اضلاع میں بھی کم سے کم ۵۰ سے ۶۰ ہزار افراد جاں بحق ہوئے لیکن سب سے زیادہ اثر شانتی صوبہ پر پڑا جہاں ۵۰ لاکھ افراد قحط سے ختم ہوگئے۔

برطانیہ میں چین قحط امدادی فنڈ کے لیے تحریک شروع کی گئی۔ مسیحی تبلیغی کارکنان کے مطابق ''قحط کے لیے امداد مسیحیت پھیلانے کے لیے ایک خدائی طریقہ تھا۔''[۷] برٹش کونسل کا کہنا تھا کہ (چین کے دروازے) کھولنے کے لیے ایک درجن جنگوں سے کہیں زیادہ مفید حربہ بہادر اور انصاف پسند مردوں کا چین میں امدادی چندوں کو بانٹنا ہے۔''[۸]

برازیل میں خشک سالی ہندوستان سے چھ ماہ بعد پہنچی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ برازیل میں خشک سالی کی وجہ جنگلات کا بڑے پیمانے پر خاتمہ تھا جو کہ صرف کپاس کی کاشت کے لیے کیا گیا تھا۔[۹] عالمی بحران کی وجہ سے کپاس کی مانگ میں خاتمہ کا نتیجہ یہ تھا کہ بڑی تعداد میں مزدور کام ڈھونڈنے کے لیے دربدر ہونے لگے۔ بھوک اور قحط کو برازیل کے علاقوں میں روکنے کے لیے اناج کی درآمد کی ضرورت تھی۔

ہندوستان اور برازیل میں قحط سے نمٹنے کے لیے کاروباری بنیاد پر اناج کی فراہمی ناکافی تھی۔ موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ تاجروں نے اناج کی تجارت سے بے تحاشہ منافع اکھٹا کیا لیکن یہ طریقہ اندرونی برازیل میں بھوک مٹانے سے قاصر تھا۔ کچھ اناج جانوروں پر لاد کر اندرون برازیل بھیجا گیا لیکن جانور یا تو مطلوبہ مقام پر پہنچنے سے پہلے ہی مر گئے یا پھر ان کو راستے میں لوٹ لیا گیا۔ جو تھوڑا بہت اناج پہنچ سکا اس کو تاجروں نے منہ مانگی قیمت پر فروخت کیا لیکن صرف دولت مند افراد ہی اس غلہ کو خرید سکے۔ سامراجی حکومت نے اول تو امداد بھیجنے میں کافی تاخیر کی اور جو کچھ بھیجا گیا وہ بہت حد تک ناکافی تھا۔

قحط زدہ علاقوں سے نکل کر لوگوں نے ایسے علاقوں کا رخ کیا جو کہ خشک سالی سے متاثر نہیں ہوئے تھے۔ ان علاقوں میں انسانوں اور جانوروں کے ہاتھوں کھڑی فصلوں کو شدید نقصان پہنچا۔ نتیجتاً یہاں کے مقامی لوگوں کو بھی کھانے کی شدید کمی سے دوچار ہونا پڑا۔

خشک سالی کے علاقہ سیرہ (Ceara) میں ایک سال کے اندر اندر ۵۰,۰۰۰ افراد جاں بحق اور شمال مغربی صوبوں میں بھی دسیوں ہزار لوگ ختم ہوگئے۔ جوں جوں لوگوں نے شہر کا رخ کرنا شروع کیا، شہری اشرافیہ نے خوف کے مارے برطانوی راج کی مثال پر عمل کرتے ہوئے امداد کا آغاز کیا، جو کہ لوگوں کو صرف کام کے عوض دی جاتی تھی۔ ہندوستان کی طرح برازیل میں بھی امدادی کیمپوں میں غلاظت کی وجہ سے چیچک کی وبا پھیل گئی۔ ۱۸۷۹ء تک سیرہ میں ایک لاکھ افراد ختم ہو چکے تھے۔

جہاں ۱۸۷۷ء برازیل کی تاریخ میں خشک سالی جیسے المیہ کے لیے یاد کیا جاتا ہے، وہاں برازیل کے حکمراں طبقے کے کچھ حصوں کے لیے ''خشک سالی کی صنعت'' بہت منافع بخش ثابت ہوئی جس کی ایک مثال برطانوی تجارتی کمپنی سنگل ہرسٹ، براکل ہرسٹ ہے۔ قحط کے زمانے میں اس کمپنی نے اپنے پانی کے جہازوں کے ذریعے برازیلی حکومت کو بڑے پیمانے پر مختلف ضروری اشیاء فراہم کیں اور اسی ذریعے سے قحط سے دوچار ہزاروں پناہ گزینوں کو ایمیزون کے علاقے تک پہنچایا جہاں مزدوروں کی شدید قلت تھی۔ اسی طرح سامراجی امداد سے گنے کے کھیتوں کے مالکان کو بہت منافع ہوا۔ یہ امداد خشک سالی سے متاثرین کے لیے کھیتوں پر عارضی کام مہیا کرنے کے لیے دی گئی تھی۔ صوبائی اور مقامی سیاست میں حاوی بڑے بڑے جاگیرداروں کو ہنگامی فنڈز کے لوٹ مار کا کھلا موقع ملا اور پھر یہ سلسلہ سالوں جاری رہا۔ نتیجتاً ''خشک سالی کے لیے امداد'' کے طور پر بھیجی گئی ایک کثیر رقم، جس کا مقصد نہر سازی یا پانی کے ذخیروں کی تعمیر تھی، کا کوئی نام ونشان نہیں ملا۔

☆ ڈیویس، مائیک، ''لیٹ ویکٹورین ہولوکاسٹس: النینو فیمینز اینڈ دی میکنگ آف دی تھرڈ ورلڈ''، ورسو، ۲۰۰۱ء۔

حوالہ جات:

۱۔ کے ڈیسلوا، ''ہسٹری آف سری لنکا''، برکلے ۱۹۸۱ء، صفحہ ۳۰۸۔

۲۔ اریک فونر، ''ریکنٹرکشن: امریکاز ان فنیشٹ ریویولوشن''، ۱۸۶۳ء-۱۸۷۷ء، نیو یارک ۱۹۸۸ء، صفحہ ۵۱۲-۵۱۳۔

۳۔ اریک ہوبس بوم، ''دی ایج آف کیپٹل ۱۸۴۸ء-۱۸۷۵ء''، لندن ۱۹۷۵ء، صفحہ ۴۶۔

۴۔ برتج لال، ڈگ مونگرو اینڈ ایڈورڈ بیچ ہرٹ، ''پلانٹیشن ورکرز: ریزیلیٹنس اینڈ ایکاموڈیشن''، ہونولولو، ۱۹۹۳ء، صفحہ ۳-۴۔

۵۔ ریورینڈ ٹیمیتھی ریچرڈ کا حوالہ جو کہ پیش کیا گیا پال بور، ''فیمن ان چائنا اینڈ دی میشنری''، کیمبرج، میساشوسیٹس، صفحہ ۱۴۔

۶۔ ریورینڈ ٹیمیتھی ریچرڈ کا حوالہ، صفحہ ۱۱۹۔

۷۔ لیلئن لی، ''انٹروڈکشن: فوڈ، فیمن، اینڈ دی چائنیز اسٹیٹ''، جرنل آف ایشیئن اسٹڈیز، ۴۱:۴، اگست ۱۹۸۲ء، صفحہ ۷۰۰۔

۸۔ ڈیوڈ آرنلڈ، ''فیمن: سوشل کرائسس اینڈ ہسٹاریکل چینج''، لندن ۱۹۸۸ء، صفحہ ۱۳۷۔

۹۔ پیئر ڈینس، ''برازیل''، لندن ۱۹۱۱ء، صفحہ ۳۳۰۔

عالمی زراعتی معاہدہ اور تیسری دنیا*

تحریر: سرتاج خان

۱۹۴۸ء سے عالمی تجارت کے لیے اصول بنانا اور جائزہ لینے کا کام ایک عالمی معاہدے کے تحت ہو رہا تھا جو کہ جنرل ایگریمنٹ آن ٹیریف اینڈ ٹریڈ (GATT) کے نام سے جانا جاتا تھا۔ ۱۹۸۶ء سے ۱۹۹۴ء تک اس معاہدہ کے تحت کچھ نئے اصول وضوابط طے کیے گئے۔ ان نئے قوانین کے تحت پرانے معاہدہ کی جگہ ایک ادارے ڈبلیوٹی او (WTO) نے لے لی۔ ڈبلیوٹی او یا عالمی تجارتی ادارے کے تحت آزاد معیشت پر مبنی تجارت کی بہت حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ یہ ادارہ دراصل ان بڑی بڑی کمپنیوں کے مفاد کی نگرانی کرتا ہے جو عالمی پیمانے پر تجارت کرتی ہیں اور جن کا تعلق پہلی دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں سے ہے۔ ڈبلیوٹی او کو نہ صرف ملکوں کی تجارت کی دیکھ بھال بلکہ ان پر تجارتی پابندیاں لگانے کے اختیارات بھی دیئے گئے ہیں۔ یہ بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ ڈبلیوٹی او سے نہ صرف تیسری دنیا کی پیداواری صلاحیت کو شدید نقصان پہنچے گا بلکہ عام انسان کی بنیادی ضرورتوں کا حصول بھی مشکل تر ہو جائے گا۔ ڈبلیوٹی او میں تقریباً ۳۰ معاہدے شامل ہیں جو کہ الگ الگ شعبہ جات پر لاگو ہوتے ہیں۔

تیسری دنیا کے حوالے سے ان میں سے مندرجہ ذیل دو معاہدوں کو بہت اہمیت حاصل ہے جو بنیادی طور پر زرعی ہیں:

- زراعتی معاہدہ (ایگریمنٹ آن ایگریکلچر)
- ذہنی ملکیت کا معاہدہ (ٹریڈ ریلیٹڈ ایگریمنٹ آن پراپرٹی رائٹس) ہے

اس مضمون میں ہم صرف زراعتی معاہدہ کا جائزہ لیں گے۔ زراعتی معاہدہ کے تین نکات بہت اہم ہیں۔

- زراعت کے لیے ملکی مراعات میں کمی۔
- برآمدی مراعات میں کمی۔
- منڈی تک آزادانہ رسائی۔

زراعت کے لیے ملکی مراعات میں کمی

پہلی دنیا اور تیسری دنیا کے لیے مراعات میں کمی کی وضاحت الگ الگ اصولوں کے تحت کی گئی ہے۔

پہلی دنیا کے ممالک چھ سال کے عرصہ کے دوران زراعت کیلئے مراعات میں بیس فیصد کمی کریں گے۔ یعنی ۱۹۹۵ء سے شروع کر کے مراعات کو ہر سال تھوڑا تھوڑا کم کرنا ہے جبکہ دسمبر ۲۰۰۰ء تک بیس فیصد کمی لازمی ہے۔

تیسری دنیا کے ممالک کو دس سال کے عرصہ کے دوران مراعات کے مد میں ۱۳ء۳ فیصد کمی کرنی ہے۔ یعنی ۱۹۹۵ء سے شروع ہو کر ہر سال تھوڑا کم کرتے کرتے دسمبر ۲۰۰۴ء تک پورے ۱۳ء۳ فیصد مراعات کے ہدف کا حصول لازمی ہے۔

امریکہ اور یورپ نے ۱۹۸۶ء کو بنیادی سال کے طور پر چنا ہے، اس سال ان دونوں قوتوں نے اپنی زراعت کو سب سے زیادہ مراعات دی تھیں۔ اس طرح اگر ۱۹۸۶ء میں دی گئی مراعات کو بنیاد یا معیار بنایا جائے اور اس پر ۲۰ فیصد کمی کی جائے گی تب بھی ۲۰۰۰ء میں جو مراعات یہ ممالک اپنی زراعت کو دیں گے وہ ان مراعات سے کہیں زیادہ ہوں گی جو یہ ممالک عام طور سے دیتے ہیں۔

تیسری دنیا کے ممالک کے نزدیک اس بنیادی سال کی کوئی اہمیت نہیں ہے کیونکہ ہمارے ہاں زراعت کے شعبے میں مراعات بہت کم دی جاتی ہیں اس طرح امیر ممالک ۲۰ فیصد کم کر کے بھی ہم سے کہیں زیادہ اپنے زراعت کے شعبے کو مراعات دے سکتے ہیں۔

دیگر مراعات

معاہدے کے تحت تمام ممالک کسانوں کو پیسہ کی شکل میں امداد دے سکتے ہیں۔ اس میں امیر ملکوں کو بہت سہولت ہے، کیونکہ ان ممالک میں کل ۲ فیصد باشندے زراعت کے شعبے سے وابستہ ہیں، حکومت ان کو پیسے کی شکل میں امداد دے سکتی ہے۔ ہمارے ملک میں کم سے کم ۴۰ فیصد باشندے کھیتی باڑی کرتے ہیں اور حکومت کے پاس سب کو پیسہ کی شکل میں امداد فراہم کرنے کے لیے رقم نہیں۔ اس کے علاوہ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کی شرائط کی وجہ سے حکومت کو عوام کی فلاح و بہبود کے لیے اخراجات کرنے پر سخت پابندی عائد ہے۔ حکومت کا زور اسلحہ خریدنے اور قرضوں کی واپسی پر ہے اور عوام کی ضروریات کی اہمیت ان کے لیے ایک غیر اہم چیز ہے۔

ایسے ممالک جو ماضی میں مراعات نہیں دیتے تھے آئندہ بھی ان کے پاس یہ آزادی نہیں رہی کہ وہ یہ سہولت اپنے زراعت کے شعبہ کو دے سکیں۔ امریکہ دنیا کے دو تہائی اناج کو سپلائی کرتا ہے اور جیسا کہ قومی مراعات کے جائزہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ ممالک اپنے زراعت کے شعبہ کو بہت مراعات دیتے ہیں۔ اس طرح سے امریکی زرعی کمپنیاں (ایگرو بزنس کمپنیاں) اپنے ملک سے سستے داموں اناج اٹھا کر دوسرے ملکوں میں بھی سستے داموں بیچنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ اس میں دوسرے ملکوں کے زراعت کے شعبہ میں کسانوں کو بہت نقصان پہنچنے کا امکان ہے۔ اس مسئلہ کا سامنا خاص طور پر تیسری دنیا کے کسانوں کو ہے۔ اگر ان کی مارکیٹ میں غیر ملکی اناج سستے داموں بکتا ہے تو وہ اگر اپنے دام کم کرتے ہیں تو خسارے میں جاتے ہیں اور اس طرح کچھ سالوں کے بعد قرضوں کے دباؤ میں وہ اپنی

* چیلنج، مئی ۲۰۰۱ء، صفحہ ۶ تا ۸.

زمین سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

منڈی تک رسائی

یہ معاہدے کی سب سے اہم شرط ہے اور اس کے پس منظر میں بین الاقوامی کمپنیوں کو دنیا بھر کے ملکوں کی زراعتی منڈی تک رسائی فراہم کی جارہی ہے۔ عام طور پر تمام ممالک درآمدات پر بھاری ٹیکس لگا کر اپنے ملک کی مصنوعات اور اجناس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اس طرح ہر ملک کوشش کرتا ہے کہ زرعی اجناس میں خود کفالت حاصل کی جائے۔ ملک میں اس طرح روزگار بڑھتا ہے اور قیمتی زرمبادلہ بھی بچایا جاسکتا ہے۔ اس پالیسی کے باوجود اگر کوئی کمپنی درآمد کرنے پر آمادہ ہوتی ہے تو حکومت کو نہ صرف درآمدی ٹیکس کی مد میں رقم حاصل ہوتی ہے بلکہ وہ چیز ٹیکس نافذ ہونے کی وجہ سے مہنگی ہوجاتی ہے اور مقامی جنس قیمت کم ہونے کی وجہ سے منڈی میں برتری حاصل کرلیتی ہے۔ قومی منڈی کو سہولت دینے کے لیے حکومتیں کوٹہ سسٹم بھی رائج کرتی ہیں جس کی وجہ سے ایک مخصوص مقدار میں اجناس کی درآمد کی اجازت ہوتی ہے لیکن کوٹہ سسٹم کو نئی آزاد معیشت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔

عالمی زراعتی معاہدے کے تحت ترقی یافتہ ممالک کو ۳۶ فیصد محصولات کم کرنا ہونگی اور ترقی پذیر ممالک کو محصولات میں ۲۴ فیصد کمی کرنا ہوگی اور کوٹہ سسٹم کو بالکل ختم کردینا ہوگا۔

امریکہ اور یورپ نے کوٹہ سسٹم ختم تو کردیا ہے لیکن جو کوٹے ہٹائے ہیں ان کو پہلے محصولات میں بدلنا تھا۔ جب کوٹے کو محصولات کی شکل میں تبدیل کیا گیا تو اصلی لاگت سے زیادہ لاگت لگا کر بہت اونچے محصولات لگائے گئے، خاص کر ان اشیاء پر جو ان کی منڈی میں باہر کے ممالک سے درآمد کی جاتی تھیں۔

اب ان محصولات کو ۳۶ فیصد کم کرنا ہے کیونکہ یہ محصولات بہت زیادہ ہیں۔ اس کمی کے باوجود بھی ان کی منڈی باہر کے ملکوں کے لیے مہنگی رہے گی۔ دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ محصول اوسطً ۳۶ فیصد کم کرنا تھا اور ہر چیز پر کم از کم ۱۵ فیصد کمی کرنی تھی۔ اس طرح یہ ممالک ان اشیاء پر محصولات کم کررہے ہیں جن پر ان کی منڈی میں مقابلہ کم ہے اور ان اشیاء پر محصولات بڑھا کر رکھے ہوئے ہیں، جن کے مقابلے میں وہ دوسرے ملکوں کی اشیاء کو اپنی منڈی میں پنپنے نہیں دینا چاہتے۔

ان محصولات کا فائدہ دراصل ایکسپورٹرز کو ہے جو خاص طور پر یورپ اور امریکہ کی بڑی بڑی ایگرو بزنس ملٹی نیشنل کمپنیاں ہیں۔ کسان چاہے وہ پہلی دنیا کے ہوں یا تیسری دنیا کے ان کو سخت مالی نقصان ہے۔ جس سے وہ بھاری قرضے میں ڈوب کر بالآخر اپنی زمینوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ اس طرح سے کارپوریٹ فارمنگ یعنی سرمایہ دارانہ کاشت کاری کا نظام آسانی سے ہمارے ممالک میں عام ہوجائے گا۔

اب چھوٹے کاشت کاروں کے پاس بچت کا پیسہ نہیں ہوتا اور وہ زیادہ تر قرضے پر اپنی زمین کو کاشت کرتے ہیں۔ ان کا انحصار حکومتی رعایت پر ہوتا ہے مثلاً گندم پر امدادی قیمت وغیرہ۔ آئی ایم ایف، ورلڈ بینک اور ڈبلیو ٹی او کے اجتماعی شرائط اور معاہدوں کے تحت ان میں اتنی سکت باقی نہیں رہے گی کہ وہ بڑی بڑی کمپنیوں کی سرمایہ دارانہ قوتوں کے آگے ڈٹ سکیں۔ اسکی ایک مثال ہمارے ملک میں نوارٹس (Novartis) اور دیگر کمپنیوں کی ون شاپ (one shop) دکانوں کی ہے۔ ہر کمپنی صرف اپنی ہی اشیاء بیچتی ہے اور سامان قرضہ پر نہیں دیتی۔ اس طرح جب کاشت کار کے پاس پیسہ نہیں ہوگا اور وہ اشیاء سود پر نہیں لے سکے گا تو پھر اس کے لیے زمین کاشت کرنا بھی مشکل ہوجائے گا اور آخر کار اس کے پاس زمین بیچنے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں رہے گا۔

حکومت کو آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے معاہدہ کے تحت بجلی اور لائٹ ڈیزل آئل کی قیمتوں میں اضافہ کرنا پڑا جس سے زراعتی شعبہ میں قیمتیں بہت بڑھیں۔ ان قیمتوں سے چھوٹے کاشت کار ٹیوب ویل کا پانی استعمال کرنے کے قابل نہیں رہے ہیں اسی طرح اب حکومت نے سوائے گندم کے ہر چیز سے امدادی قیمت کا خاتمہ کردیا ہے۔ پاکستان نے اپنی منڈی پر ۱۰۰-۱۵۰ فیصد محصولات لگائے تھے لیکن آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے معاہدوں کی وجہ سے ۱۹۹۶ء میں ۶۵ فیصد تک کمی کردی گئی۔ ۱۹۹۹ء میں ۳۵ فیصد اور بالآخر جولائی ۲۰۰۱ء میں ۳۰ فیصد تک لیکر آئیں گے۔ خبر یہ ہے کہ اگلے سالوں میں محصولات اس سے بھی کم کردیے جائیں گے۔

ان اقدامات سے یہ بات یقینی ہوجاتی ہے کہ اب پاکستان میں بین الاقوامی کمپنیاں ہماری منڈی تک رسائی میں کامیاب ہوجائیں گی اور مقامی کسانوں کی تباہی کا سبب بنیں گی۔ ان کمپنیوں کا اثاثہ تیسری دنیا کے کئی ملکوں کی آمدنی سے زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک ان کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتے۔ ان کمپنیوں کے ہیڈ کوارٹرز پہلی دنیا کے ملکوں میں ہیں اور ان کو پہلی دنیا کی حکومتیں پورا تحفظ فراہم کرتی ہیں۔ اس طرح پاکستان سمیت تیسری دنیا کی حکومتیں پہلی دنیا کی سازشی پالیسیوں پر کاربند ہونے پر مجبور ہوجاتی ہیں۔

چونکہ ہماری معاشی پالیسیاں آئی ایم ایف، ورلڈ بینک اور ڈبلیو ٹی او کے زیر اثر بنتی ہیں اس لیے عام آدمی آج دو وقت کی روٹی کو ترس رہا ہے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ان شرائط کو ماننے کے بدلے جن مراعات کے وعدے کیے جاتے ہیں وہ کبھی حاصل نہیں ہوتے، مثال کے طور پر ڈبلیو ٹی او، کے معاہدوں کے تحت وہ ممالک جن کی خوراک کا زیادہ تر انحصار درآمدات پر ہوتا ہے ان کے لیے کچھ سہولتیں رکھی گئیں ہیں۔ اس تناظر میں پاکستان امداد حاصل کرنے کا حقدار بنتا ہے کیونکہ پاکستان گندم اور پکانے کا تیل بہت زیادہ درآمد کرتا ہے لیکن اب تک ہمیں کسی قسم کی ٹیکنیکل، معاشی یا خوراک کی امداد حاصل نہیں ہوئی۔

زراعت کے شعبے میں مراعات، ان کی اهمیت اور هماری حکومت کی پالیسیاں

معیشت کے فروغ اور ترقی کا دارو مدار زراعت کے شعبے کی بهتر کارکردگی پر هوتا هے۔ اس لیے دنیا بهر کی حکومتیں خاص طور پر امیر ممالك اپنے زراعت کے شعبے کو خصوصی مراعات دیتے هیں۔ تیسری دنیا کے ممالك معاشی طور پر خوشحال نهیں پهر بهی وه حسب توفیق اپنے زراعت کے شعبے کو مراعات دیتے هیں کیونکه صنعتی ترقی اور عوام کی خوراك کی ضروریات کا دارومدار زراعت کی بهتر کارکردگی پر هوتا هے۔ اس وجه سے مختلف طریقوں سے حکومت کی مدد درکار هوتی هے۔ مثلاً

- آب پاشی نظام، پلوں اور راستوں کو بهتر بنانا جس سے زراعتی اشیاء کو مارکیٹ تك پهنچنے میں آسانی هو۔
- زرعی مشینری اور بیج وغیره خریدنے کے لیے آسان شرائط پر قرضه جات کی فراهمی یقینی بنانا۔
- زرعی مشینری کی پیداوار کو بهتر بنانے اور اسکو کسان تك سستے داموں پهنچانے کے لیے اعانت فراهم کرنا۔
- کسانوں کو ان کی فصل کی اچهی اور غیر متبدل امدادی قیمت دینا تاکه ان کی مالی حالت بهتر هو سکے۔

آئی ایم ایف، ورلڈ بینك اور ڈبلیو ٹی او کے دباؤ پر آجکل هماری حکومت ایسے اقدامات کررهی هے جس سے عام طور پر زراعت کے شعبے کو اور خاص طور پر کسان کو شدید نقصان پهنچنے کا خطره هے۔ مثلاً

- حکومت نے آئی ایم ایف کے دباؤ کے تحت زرعی دواؤں اور یوریا پر ۱۵ فیصد سیلز ٹیکس لگانے کا فیصله کیا هے۔
- حکومت نے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینك کے شرائط کے تحت گندم کے علاوه هر فصل کی امدادی قیمت ختم کردینے کا فیصله کیا هے۔ گندم کی امدادی قیمت کچھ عرصے میں ختم کردی جائے گی۔
- گندم کی فصل کو دس سے پندره ارب روپے کی مالی اعانت حکومت دیتی تهی جسے بین الاقوامی قرضه دینے والے اداروں کے دباؤ پر ختم کردینے کا فیصله کیا گیا هے۔
- حکومت نے بے زمین هاریوں کو زمین دینے کے بجائے سرمایه دارانه زراعت رائج کرنے کا پروگرام بنایا هے، جس سے بڑی بڑی کمپنیوں کو لاکهوں ایکڑ زمین پر ان کی مرضی کی فصل کاشت کرنے کا اختیار حاصل هوجائے گا۔

کارپوریشن کیا هیں؟

کارپوریشن ایسی کمپنی کو کهتے هیں، جس کی قانونی حیثیت ایك انسان کی قانونی حیثیت کے برابرهوتی هے۔ یعنی ایك کمپنی اپنے حقوق کے لیے اسی قانون کی سطح پر لڑسکتی هے جس پر ایك انسان اپنے حقوق کی حفاظت کرسکتا هے۔ سمجهنے کی بات یه هے که ایك انسان کے پاس صرف اپنے وسائل هوتے هیں جب که کمپنی کے پاس پورے ادارے کے وسائل هوتے هیں۔ جس میں سرمایه، اثر و رسوخ، وکیل اور مختلف ٹیکنیکل شعبه جات سے وابسته عمله شامل هے۔ بعض کمپنیوں کی سالانه آمدنی ترقی پذیر ملکوں کی کل آمدنی سے کهیں زیاده هوتی هے۔ اس پوری طاقت کے ساتھ ایك کمپنی کو ایك انسان کی حیثیت دے دی جاتی هے۔ اس طرح جب یه کمپنی اپنے حقوق کے لیے قانون کا سهارا لیتی هے تو اس کی طاقت ایك عام انسان سے هزار گنا زیاده هوجاتی هے اور جب ایك انسان اس کارپوریشن سے اپنے حقوق کے لیے کچهری میں کهڑا هوتا هے تو مقابله برابری کی سطح پر هو هی نهیں سکتا۔

کینکون وزارتی اجلاس کی ناکامی اور جزوی کامیابی*

ولی حیدر

عالمی تجارتی ادارہ (ڈبلیوٹی او) کا پانچواں وزارتی اجلاس مزدور کسان ''قاتل'' مقام کینکون، میکسیکو میں ستمبر ۲۰۰۳ء میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کی ڈرامائی ناکامی نے اس بات کو ایک بار پھر ثابت کر دکھایا ہے کہ پسے ہوئے طبقہ کے حالات کتنے ہی بدتر کیوں نہ ہوں مگر بھرپور مزاحمت بہرحال نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے۔ بلاشبہ مندرجہ ذیل خیالات رکھنے والے گروہوں اور افراد کے لیے کانفرنس کی ناکامی ایک بہت بڑی خوشخبری ہے:

''اس کے باوجود کہ عراق میں جنگ ابھی جاری ہے، ایک اور جنگ کا آغاز کینکون میں ہونے والا ہے۔ ہاں شائد یہ عراقی جنگ جیسی خونریز نہ ہو مگر کسی حوالے سے بھی عراقی تشدد سے کم نہ ہوگی کیوں کہ اگر ڈبلیوٹی او میں بات چیت کے نئے راؤنڈ کے آغاز پر آمادگی ہو جاتی ہے تو یہ دنیا کے کروڑوں مزدور کسانوں . . . کے لیے زندگی اور موت کا سوال ہوگا۔[۱]'' دوسری طرف برطانوی مندوب پیٹریشیا ہیوٹ کے لیے یہ ناکامی شائد پژمردگی کا باعث تھی۔ جنہوں نے کانفرنس سے قبل پہلی دنیا کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا تھا کہ: ''اگر ہم ناکام ہوئے تو یہ دنیا کی معیشت کے لیے بڑی تباہی ہوگی۔[۲]''

تیسری دنیا کے ممالک پر مشتمل گروپ ۲۱ کے رکن ممالک

ارجنٹائن، بلیویا، برازیل، چلی، چین، کولمبیا، کوسٹاریکا، کیوبا، ایکوڈور، مصر، گوئٹے مالا، انڈیا، انڈونیشیاء، میکسیکو، نائجیریا، پاکستان، پیراگوئے، پیرو، فلپائن، جنوبی افریقہ، تھائی لینڈ اور وینزویلا۔

تیسری دنیا کے ممالک پر مشتمل گروپ ۲۱ کینکون اجلاس میں بھرپور حکمت عملی کے ساتھ شریک ہوا۔ چین، برازیل اور انڈیا کی سربراہی میں یورپ اور امریکہ کی زرعی پالیسیوں پر سخت مزاحمت کا مظاہرہ کیا گیا۔ ان کا موقف تھا کہ یورپ اور امریکہ دوہا اعلامیہ کے مطابق اپنی زرعی پالیسیوں کو مرتب کریں جس میں ترقی پزیر ممالک کے لیے منڈی تک آسان رسائی اور ترقی یافتہ ممالک کی جانب سے اپنے زرعی شعبوں میں دی جانے والی سالانہ ۳۰۰ بلین ڈالر کی خطیر مراعتی رقم میں خاطر خواہ کمی شامل تھی۔ دوسری طرف ترقی یافتہ ممالک کا اصرار تھا کہ سنگاپور ایشوز ☆ خاص کر کے ڈبلیوٹی او میں نئے موضوعات کی شمولیت کے حوالے سے بات چیت کا آغاز کیا جائے۔

فریقین کے الگ الگ موقف کے باعث بالآخر کانفرنس ناکامی کے اعلان کے ساتھ اختتام پزیر ہوئی۔ اجلاس سے سب سے پہلے احتجاجاً باہر نکلنے والے کینیا کے وزیر تجارت ڈاکٹر موکھیسا کٹوائی نے کہا: ''میں کہوں گا کہ اس کانفرنس کے ناکامی کے ذمہ دار وہ لوگ ہیں جنہوں نے مصنوعی طریقے سے اتفاق رائے پیدا کرنے کی کوشش کی اور بات چیت کے عمل میں رخنہ ڈالا۔ میرے خیال میں یورپ اور امریکہ اس ناکامی کے ذمہ دار ہیں۔[۳]''

ان حالات نے ترقی یافتہ ممالک کے اصل چہرے کو پہچاننے اور حقائق کو سمجھنے میں مزید مدد دی ہے۔ وزارتی اجلاس کی ناکامی کے فوراً بعد یورپی تجارتی کمشنر پاسکل لامے نے یورپی اراکین پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''موجودہ اجلاس کی ناکامی سے ہم سب کچھ ہار بیٹھے ہیں۔'' ہمیں اس سوال کا جواب تلاش کرنا ہے کہ آیا ہم اب بھی کثیر الملکی تجارت کو ترجیح دیں گے جو کہ یورپی یونین کی خارجی پالیسی کی ایک ترجیح ہے۔ کیا یہ ترجیح ہم نے اپنے شراکت دار (پارٹنر) پر واضح کی ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو کیا ہم میں اتنی قوت ہے کہ ہم ان کے ذہنوں کو تبدیل کر سکیں؟ یا پھر اس کے متبادل دو طرفہ تجارت اب بھی ایک ذریعہ ہے؟[۴]''

دوسری طرف امریکہ بھی کینکون اجلاس کی ناکامی کے بعد دوطرفہ تجارت کو اہمیت دینے پر زور دے رہا ہے۔ امریکی تجارتی نمائندے باب زیولیک نے کہا کہ:

''کینکون کی ناکامی نے امریکہ کو دوطرفہ تجارت کی طرف مزید دھکیل دیا ہے۔ ہم کسی نہ کسی طرح سے آزاد تجارت کو برقرار رکھیں گے۔ ہم ہمیشہ کے لیے انتظار نہیں کر سکتے، اس لیے ہم تجارت کے لیے دوسری سمتوں میں جا رہے ہیں۔[۵]''

دوطرفہ تجارتی معاہدوں میں شرائط باآسانی طاقت کے ذریعہ منوائی جا سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر حال ہی میں ملائیشیا کے (سابق) وزیراعظم مہاتر محمد نے ''یہودی آبادی کم ہونے کے باوجود ان کا پوری دنیا پر مسلط'' ہونے کا بیان دیا۔ امریکہ نے مذکورہ بیان کی سختی سے مذمت کی اور دوطرفہ معاہدے کے تحت دفاعی ترقی کے لیے امدادی رقم کی ادائیگی، اس بیان کی واپسی اور مذہبی آزادی کے حکومتی اقدامات سے مشروط کرتے ہوئے روکنے کا عندیہ دیا ہے۔[۶]

بہرحال یہ سمجھنا کہ امریکہ اور یورپی یونین دوطرفہ تجارت کو ہی متبادل سمجھنے لگے ہیں قبل از وقت ہے۔ ان کی بھرپور کوشش ہے کہ عالمی تجارت کو باضابطہ تنظیم کے ذریعے ہی چلایا جائے۔ بات چیت کے دور کو دوبارہ بحال کرنے کی بھرپور کوششیں جاری ہیں اور دسمبر ۲۰۰۳ء تک کسی نتیجہ پر پہنچنے کا امکان بھی ظاہر کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں ڈبلیوٹی او کے ڈائریکٹر جنرل سپاچی نے ممبر ممالک کا دورہ بھی شروع کر دیا ہے تاکہ بات چیت کے دوبارہ آغاز کے سلسلے میں پیش رفت ہو سکے۔ غیر ملکی دورے کی شروعات پاکستان سے کی گئی ہے اور ڈبلیوٹی او کے سربراہ نے پاکستانی صدر جنرل پرویز مشرف

☆ سنگاپور ایشوز (نکات): ڈبلیوٹی او کے سنگاپور وزارتی اجلاس، ۱۹۹۶ء میں ممبران نے چار نئے نکات ڈبلیوٹی او میں شامل کرنے کے معاملے پر بات چیت کی جن میں (i) بیرونی سرمایہ کاری (ii) منڈی میں مقابلہ کے لیے پالیسی (iii) حکومتی خرید و فروخت (iv) تجارتی سہولیات مثلاً کسٹم کلیرنس شامل ہیں۔ جنہیں ''سنگاپور ایشوز'' کہا جاتا ہے۔

* چیلنج، جولائی تا دسمبر ۲۰۰۳ء، صفحہ ۶ تا ۸.

سے ملاقات کے دوران واضح کیا کہ پاکستان ڈبلیوٹی او کا ایک اہم رکن ہے۔ ملاقات کے دوران سپاچی نے جنرل مشرف کے اس خیال سے اتفاق ظاہر کیا کہ ترقی یافتہ ممالک کی خطیر زرعی مراعات، ترقی پزیر ممالک کی زرعی اجناس کی عالمی منڈی تک رسائی میں رکاوٹ ہیں۔ ۷ دوسری طرف یورپی یونین اور امریکہ نے گروپ ۲۱ کے کچھ ممالک پیرو، کولمبیا، کوسٹاریکا، گوئٹے مالا، ایکوڈور اور بولیویا پر اپنے موقف سے ہٹانے کے لیے دباؤ بڑھانے کی مہم کا آغاز کر دیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ گروپ ۲۱ کب تک اپنے موقف میں ڈٹا رہتا ہے۔

امریکہ اور یورپ کے لیے ایک پریشان کن مسئلہ رعایتوں کے حوالے سے دی گئی مدت، (جسے ''پیس کلاز'' میں بیان کیا گیا ہے) کا دسمبر ۲۰۰۳ء میں خاتمہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایسے ممالک جو اپنے زرعی شعبوں کو رعایتیں دے رہے ہیں ان کے خلاف دوسرے ممبر ممالک ڈبلیوٹی او کے قانون کے مطابق مقدمہ درج کر سکیں گے۔ برازیل، آسٹریلیا، ارجنٹائن جیسے زرعی ممالک، جن کی زرعی معیشت انتہائی حد تک مضبوط ہے، پیس کلاز کی مہلت کے اختتام سے فائدے اٹھا سکتے ہیں۔

کینکون اجلاس کی ناکامی پر ترقی یافتہ ممالک کی جانب سے سخت برہمی کے اظہار کے ساتھ ساتھ اپنی اپنی تجارتی پالیسیوں میں انتہائی اہم نوعیت کی تبدیلیوں کا اشارہ بلاشبہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ڈبلیوٹی او سے وابستہ امیدیں (کہ یہ ادارہ ہمیشہ جی-۸ ممالک کے مفادات کو تحفظ فراہم کرتا رہے گا) فی الوقت ادھوری رہ گئی ہیں۔

ان حالات کے باوجود یہ سمجھنا کہ ڈبلیوٹی او کو ترقی پزیر ممالک اپنے مقاصد میں استعمال کرنے کے قابل ہو گئے ہیں صحیح نہیں ہوگا۔ اگرچہ ڈبلیوٹی او کے پانچ میں سے دو اجلاس ناکام رہے لیکن اس کا زیادہ تر انحصار تیسری دنیا کے ممالک کی مزاحمت کے ساتھ ساتھ عالمی صورتحال اور عوامی طاقتوں کا اپنی ریاستوں پر دباؤ اور عالمگیر تحریک پر ہے۔

اوپر دیے گئے تمام اقتباسات یہ سمجھنے میں مدد فراہم کرتے ہیں کہ ترقی یافتہ دنیا خاص کر امریکہ اور یورپ عالمی تجارت کے تمام پہلوؤں کو صرف اور صرف اپنے مفادات کے حصول کے لیے استعمال کرتے ہیں اور اگر کسی ایک پہلو میں بھی رکاوٹ پیدا ہو جائے تو اپنے ان ہی مفادات کے حصول کے لیے دوسری حکمت عملیوں کو اپنانا شروع کر دیتے ہیں۔ ان حکمت عملیوں میں ممالک کو مختلف مراعات کی پیش کش سے لیکر اقتصادی بائیکاٹ، یہاں تک کہ جنگ کی بھی نوبت آ سکتی ہے۔ عراق پر امریکی قبضہ اس بات کی کھلی دلیل ہے۔

ڈبلیوٹی او کینکون اجلاس کے موقع پر روٹس فار ایکوٹی، ترقی پسند پارٹی اور سیاف کی جانب سے خٹک محمد خان میں نکالی جانے والی احتجاجی ریلی

امریکہ و یورپی یونین اور گروپ ۲۱ کے مابین اختلافات سے قطع نظر اگر ڈبلیوٹی او کے ارکان متفقہ طور پر کسی نتیجے پر پہنچ بھی جاتے ہیں تو اس سے دنیا کے کروڑوں کسانوں اور مزدوروں کو کوئی سہولت حاصل ہو سکے گی؟ اس کا جواب صرف نفی میں ہی ملتا ہے۔ کیونکہ ترقی پزیر ممالک نے ڈبلیوٹی او میں موجود زرعی معاہدے کو یکسر مسترد کرنے کے بجائے اس میں ترامیم تجویز کی ہیں۔ ڈبلیوٹی او کا زرعی معاہدہ دراصل دنیا کی بڑی بڑی کمپنیوں کو سہولیات فراہم کرتا ہے۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اگر یورپی یونین اپنے کسانوں کو مراعات دینا بالکل ختم بھی کر دے اور تیسری دنیا کو ترقی یافتہ ممالک کی منڈیوں تک رسائی حاصل بھی ہو جائے تب بھی اس بات کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ اس کے ثمرات دنیا کے کروڑوں پر مشتمل پسے ہوئے طبقہ تک پہنچیں گے!

مثال کے طور پر مندرجہ بالا اقدامات سے کیا پاکستان میں حالیہ نافذ کردہ

کارپوریٹ فارمنگ ایکٹ کی افادیت کم ہو جائے گی کہ جس میں غیر ملکی سرمایہ کار کمپنیوں کو زرعی شعبہ میں سرمایہ کاری کی ترغیب دی گئی ہے؟ ڈبلیو ٹی او کا زرعی معاہدہ اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ زرعی شعبوں میں یہ کمپنیاں کسی بھی ملک میں سرمایہ کاری کر سکتی ہیں اور مقامی حکومتوں کو پابند کیا گیا ہے کہ اس سلسلے میں قوانین مرتب کریں اور دیگر سہولیات فراہم کریں۔ کیا بجلی، ڈیزل، کھاد، کیڑے مار ادویات کی قیمتوں اور استعمال میں کمی واقع ہو جائے گی جو کہ آئی ایم ایف، ورلڈ بینک اور ایشیائی ترقیاتی بینک کے دباؤ کے تحت عمل میں لائے گئے ہیں؟ یقیناً ایسا کچھ نہیں ہوگا تو پھر ترقی پزیر ملکوں کے لیے حالات کیوں کر بدل سکتے ہیں؟

ڈبلیو ٹی او اور اس طرح کے دیگر ادارے دراصل بڑی بڑی کارپوریشنوں کے کاروبار کو پوری دنیا تک پھیلانے میں مدد دینے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ آزاد تجارت کے نام پر بین الاقوامی کمپنیوں کے کاروبار کو وسعت دینا اور ان کی عالمی منڈی تک آسان رسائی کے راستے ہموار کرنا ان عالمی مالیاتی اداروں کا اولین نصب العین ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے اس بنیادی فلسفہ کو سمجھا جائے جس میں صرف اور صرف منافع کے حصول کو اولیت دی جاتی ہے۔ چاہے منافع کمانے کے اقدامات کے نتیجہ میں دنیا کے کروڑوں انسانوں کو بھوک و افلاس ہی کیوں نہ نصیب ہو اور بالآخر حالات سے ناامید مزدور کسان خودکشی ہی کیوں نہ کر لیں۔ جیسا کہ کوریا کے مزدور کسان لی کیونگ نے ڈبلیو ٹی او کے اجلاس کے دوران مظاہرہ میں کہا ''ڈبلیو ٹی او کسانوں کا قاتل ہے۔'' اور اس نے اپنے سینے میں خنجر گھونپ کر اس حقیقت کو واضح کیا کہ ڈبلیو ٹی او دنیا بھر کے کسانوں کے لیے ایک ایسا ادارہ ہے جس سے کسانوں کی موت تو واقع ہو سکتی ہے لیکن ان کی بہتری کے لیے کسی اقدام کی امید نہیں کی جا سکتی۔ عظیم لی کیونگ کی خودکشی دنیا بھر کے کسانوں کا ڈبلیو ٹی او اور اس کی مسلط کردہ پالیسیوں کے خلاف احتجاج اور مزاحمت کا انتہائی قدم ہے۔

سیول، کوریا میں کسانوں اور پولیس کے درمیان جھڑپ کا ایک منظر۔ کسان ڈبلیو ٹی او اجلاس کے دوران خودکشی کرنے والے کسان رہنما لی کیونگ کے جنازے کے بعد مظاہرہ کر رہے ہیں۔ بشکریہ ڈان

سرمایہ دارانہ نظام میں منافع کے حصول کے طریقوں پر کوئی قید نہیں۔ اس لیے اگر بالآخر ڈبلیو ٹی او کا ہی خاتمہ کر دیا جاتا ہے جس کا اشارہ خود امریکہ دے رہا ہے تو اس کے متبادل اس نظام کو سہارا دینے کی خاطر کسی اور ادارے یا تنظیم کو متعارف کروایا جائے گا۔ عوام دشمن پالیسیوں کے خلاف سرگرم افراد، گروہ اور اداروں کو آنے والے خطرے کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے لیے حکمت عملی ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔ تا کہ مزاحمت کے پر اثر طریقوں کو نئے خطوط پر استوار کر کے موجودہ نظام سے بھرپور مقابلہ کیا جا سکے چاہے وہ کسی بھی شکل میں ہو۔

حوالہ جات:

۱۔ وار بائی ادر مینز ڈبلیو ٹی او: ویپنز آف ماس ڈسٹرکشن
http://www.fauswab.org/popups/articles

۲۔ کینکون فی آ سکور یو لیز ریئل نیچر آف ڈبلیو ٹی او، مائیک بروکس، یکم، اکتوبر ۲۰۰۳ء۔

۳۔ کینیاز میجر رول ان ڈبلیو ٹی او ڈیڈ پیکل ان لندن، پال ریڈ فیرن، دی نیشن نیروبی ۱۷، ستمبر ۲۰۰۳ء۔

۴۔ ۳، ۲۵، ستمبر ۲۰۰۳ء Stopwtoround@yahoogroups.com

۵۔ فیل ئیلڈ کینکون ٹالک گومی ایمپوٹس ٹو بائی لیٹرل ڈیل، بریل نونٹون، انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹرابیون، ۲۳، ستمبر ۲۰۰۳ء۔

۶۔ روزنامہ جنگ، ۲۸، اکتوبر ۲۰۰۳ء۔

۷۔ ڈان ۲، اکتوبر ۲۰۰۳ء۔

دوسری عالمی خوراک کانفرنس: تحفظ خوراک پر آزاد تجارت کی برتری*

عذرا طلعت سعید

دوسری عالمی خوراک کانفرنس (ورلڈ فوڈ سمٹ) روم اٹلی میں ۱۰-۱۳، جون ۲۰۰۲ء کو منعقد ہوئی۔ پہلی کانفرنس بھی ۶ سال قبل ۱۹۹۶ء میں روم اٹلی میں ہی منعقد ہوئی تھی۔ دوسرے عالمی خوراک کانفرنس کے انعقاد کا مقصد پچھلی کانفرنس میں کیے گئے فیصلوں کا تجزیہ کرنا تھا۔

۱۹۹۶ء میں منعقد ہونے والی کانفرنس میں ۱۸۰ ممالک نے سال ۲۰۱۵ء تک دنیا میں غذائی کمی کے شکار ۸۰۰ ملین ☆ افراد کی تعداد کم کر کے نصف کرنے کا عہد کیا تھا۔ عالمی ادارہ خوراک و زراعت کے مطابق ۱۹۹۷ء-۱۹۹۹ء میں جو افراد ضرورت کے مطابق غذا حاصل کرنے میں ناکام تھے ان میں سے ۷۷ ملین افراد ترقی پذیر ممالک میں، ۲۷ ملین ترقی کی طرف تیزی سے گامزن ممالک میں اور ۱۱ ملین ترقی یافتہ ممالک میں پائے جاتے تھے۔[۱] ۱۹۹۶ء سے ۲۰۱۵ء تک ہر سال ۲۲ ملین افراد کو اگر خوراک کی کمی کے دائرے سے نکالا جائے تو ہدف تک پہنچنا ممکن ہے لیکن ۶ سال بعد دوسری کانفرنس کے موقع پر اس ہدف کا حصول مشکل ہی نہیں ناممکن نظر آ رہا ہے کیونکہ ۲۰۰۲ء عالمی خوراک کانفرنس تک یہ ثابت ہو چکا ہے کہ سالانہ ۲۲ ملین کے بجائے کل ۶ ملین افراد کو بھوک کے دائرے سے نکالا جا سکا ہے۔[۲]

عالمی ادارہ خوراک و زراعت (فوڈ اینڈ ایگریکلچر آرگنائزیشن) کے مطابق بھوک کے دائرے سے نکالے گئے ۶ ملین افراد کی کمی کا حصول اس لیے ممکن ہو سکا کیونکہ چین میں ۱۹۹۰ کی دہائی میں تقریباً ۷ ملین افراد غذائی کمی کا دائرہ توڑنے میں کامیاب ہوئے۔ اگر چین میں یہ کامیابی حاصل نہ ہوتی تو دنیا میں ۴۰ ملین ایسے افراد کا اضافہ ہوتا جو غذائی کمی اور عدم تحفظ خوراک کا شکار ہوتے۔[۳]

خوراک کے حوالے سے اس قدر بگڑی ہوئی صورت حال کے باوجود عالمی خوراک کانفرنس ۲۰۰۲ میں ترقی یافتہ ممالک کی توجہ خوراک میں کمی یا بھوک کے شکار آبادی پر نہ تھی بلکہ ان کی بھرپور کوشش رہی کہ حالات کو بہتر بنانے کے لیے کوئی ٹھوس اقدامات اور انہیں پورا کرنے والے وعدے نہ کیے جائیں مثلاً ''حق غذا'' کے استعمال پر کئی ترقی یافتہ ممالک کو اعتراض تھا۔ اعتراض کرنے والوں میں امریکہ اور کینیڈا جیسے ترقی یافتہ ممالک سرفہرست ہیں۔ امریکہ کو خدشہ تھا کہ اگر حق غذا کو تسلیم کیا جائے تو ریاستوں کو قانونی طور پر یہ حق عوام کو دینا پڑے گا۔ اس حق کی فراہمی میں ناکامی کی صورت میں حکومت کے خلاف مقدمہ دائر کیے جانے کے امکانات ہیں۔ کینیڈا کی کوشش تھی کہ وہ اس اصطلاح کو ہی عالمی کانفرنس کے مسودے سے نکال باہر کرے۔ امریکہ کو ''حق غذا'' پر عالمی سطح پر رائے عامہ ہموار ہونے اور اس پر کسی بھی قابل عمل مسودے پر سخت تشویش لاحق ہے۔ کینیڈا کا خیال ہے کہ خوراک کا حق عالمی اعلامیہ برائے انسانی حقوق میں پہلے ہی تسلیم کیا گیا ہے لہذا اس پر دوبارہ توجہ دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بالآخر بحث و مباحثہ کے بعد عالمی خوراک کانفرنس کے مسودے میں خوراک کے حق کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ''ہر فرد کو حق ہے کہ وہ صاف اور غذائیت سے بھرپور غذا حاصل کرے''۔[۴]

ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک اور تیسری دنیا کے ترقی پذیر ممالک کے لیے کانفرنس کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ترقی پذیر ممالک سے تعلق رکھنے والے ۸۰ سربراہان مملکت کانفرنس میں شریک ہوئے جبکہ صنعتی طور پر ترقی یافتہ اور دنیا میں خوراک کی سیاست پر اثر انداز ہونے والے ممالک میں سے کسی قابل ذکر ملک کے سربراہ مملکت کانفرنس میں شریک نہیں ہوئے۔ اٹلی کے فاشسٹ نظریات رکھنے والے صدر کو میزبان ملک ہونے کی وجہ سے شرکت کرنی پڑی جبکہ اسپین کے صدر نے یورپی یونین کی صدارت پر فائز ہونے کی وجہ سے شرکت کی۔ ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک کی حق غذا کی مخالفت اور سرد رویے ان کے دہرے معیار اور مقاصد کی نشاندہی کرتے ہیں۔ بظاہر تو یہ ممالک انسانی حقوق کے عالمی دعویدار اور رکھوالے ہیں لیکن دوسری طرف دنیا سے بھوک و افلاس کے خاتمے کی طرف اٹھنے والے ہر عملی اقدام کی راہ میں سب بڑی رکاوٹ بھی ہیں۔ خوراک کو بنیادی انسانی حق تسلیم نہ کرنے کی سب بڑی وجہ یہ ہے کہ ان ممالک کی بڑی بڑی کمپنیاں خوراک جیسی ''شے'' سے منافع کمانے میں مصروف ہیں اس لیے یہ خوراک کو منافع کمانے والی شکل میں ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔

ترقی یافتہ ممالک کی اقدامات کو پوری طرح عالمی خوراک کانفرنس کے مسودے کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ کانفرنس کے مسودے میں تجارت کو خوراک کی خاطر کیے جانے والے دیگر اقدامات پر اولیت دی گئی، مثلاً اس کانفرنس کے مسودے میں پہلی خوراک کانفرنس میں تحریر کیے جانے والے حکمت عملی مسودے میں تجارت کے حوالے سے کیے ہوئے اقدامات کی تکمیل کے وعدوں کی یقین دہانی کرائی گئی ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ ''تجارت ایک ایسی کنجی ہے جس کے تحت عالمی تحفظ خوراک کو یقینی بنایا جا سکتا ہے''۔[۵] اس کے علاوہ ڈبلیو ٹی او کے عالمی زراعتی معاہدے میں کیے جانے والے وعدوں کو متعین وقت میں پورا کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ عالمی خوراک کانفرنس کے مسودے میں مونٹرے کانفرنس، ڈبلیو ٹی او کے آخری وزارتی کانفرنس (جو دوہا میں ۲۰۰۱ء میں منعقد ہوئی) اور افریقہ کے لیے نئے ترقیاتی معاہدے نیپاڈ کا خاص ذکر ہے۔ ان سب معاہدوں اور کانفرنسوں کا مرکزی خیال آزاد تجارت ہی کو فروغ دینا تھا۔ خاص طور پر مونٹرے کانفرنس

* چیلنج، اپریل تا جون ۲۰۰۲ء، صفحہ ۸ تا ۱۰۔

جو کہ ۲۰۰۲ء کے شروع میں میکسیکو میں منعقد ہوئی کی مکمل توجہ بین الاقوامی تجارت پر مرکوز تھی، حالانکہ اس کانفرنس کا مقصد ترقی پزیر ممالک کی ترقی کے لیے نئی راہیں تلاش کرنا تھا۔ عالمی خوراک کانفرنس کے مسودے میں ان تمام کانفرنسوں کا ذکر اس بات کی تصدیق کے لیے کافی ہے کہ سارے بین الاقوامی ادارے چاہے وہ اقوام متحدہ ہو یا ورلڈ بینک، آزاد تجارت کے اصولوں کے مکمل عمل درآمد کو ہر مسئلے کے واحد حل کے طور پر پیش کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک مختلف بین الاقوامی مسودوں اور معاہدوں کی آڑ لے کر اپنی بین الاقوامی زرعی کمپنیوں اور بڑے بڑے سرمایہ دار کسانوں کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔ یہ ترقی یافتہ ممالک دوسرے ممالک کی زراعت اور کسان کو مختلف اداروں (جس میں ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کی نجکاری اور مراعات میں کمی کرنے والی پالیسیوں اور ڈبلیو ٹی او کے عالمی زراعتی معاہدے شامل ہیں) کے ذریعے زراعت اور زراعت سے وابستہ دیہی آبادیوں کو مہنگی پیداوار اگانے پر مجبور کر رہے ہیں۔ دوسری طرف بین الاقوامی کمپنیاں ترقی پذیر ممالک میں سستی قیمتوں پر اناج فروخت کر رہی ہیں۔ یہ امر اس لیے ممکن ہے کہ ترقی یافتہ ممالک کی حکومتیں ہزاروں، لاکھوں ڈالرز کی شکل میں کسانوں کو مراعات فراہم کرتی ہیں مثلاً امریکہ نے حال ہی میں ایک نئے قانون (فارم بل) کے تحت اپنے کسانوں (جن میں سے ۹۰ فیصد کسان بڑے سرمایہ دار ہیں) کو ۱۵-۲۰ ارب ڈالرز فراہم کرنے کا اعلان کیا ہے۔ امریکی صدر بش کا کہنا ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ امریکی زرعی پیداوار کے لیے غیر ملکی منڈیوں تک رسائی کو مزید آسان بنایا جائے۔ ان کے بقول ''ہم چاہتے ہیں کہ اپنی گائے کا گوشت، اپنی مکئی اور دالیں دنیا کے لوگوں کو بیچیں کیونکہ خوراک حاصل کرنا ان کی ضرورت ہے''۔[۶]

صدر بش کے یہ خیالات آزاد تجارت کے نظریہ سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہیں۔ آزاد تجارت کے تحت یہ کوششیں کی جارہی ہیں کہ انسانی حق کو صرف ''شئے'' کی حیثیت دے کر، اس کی خرید و فروخت کی راہ ہموار کی جائے۔ اس کے بعد جو بھی اس شئے کو خریدنے کے قابل ہو وہ اسے ''حاصل'' کر لے۔

ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک کی کوشش ہے کہ لفظ ''تحفظ خوراک'' کے معنیٰ کو محدود کر دیا جائے۔ یعنی تحفظ خوراک کو اس طرح بیان کیا جارہا ہے کہ ''ہر ایک کو حق ہے کہ وہ صاف اور غذائیت سے بھرپور خوراک حاصل کر سکے''۔ لفظ ''حاصل'' استعمال کر کے خوراک تک رسائی کا بوجھ عام انسان پر ڈال دیا گیا ہے اور قانونی طور پر خوراک ''مہیا'' کرنے کی ذمہ داری ریاست پر سے ہٹا دی گئی ہے۔ اس سازش کے تحت ترقی یافتہ ممالک کی زرعی بین الاقوامی کمپنیوں کے لیے ممکن ہے کہ وہ زرعی پیداوار کو ہر جگہ فروخت کر سکیں۔ عوام یقیناً زر کی مدد سے اسے ''حاصل'' کر سکتے ہیں۔ یعنی تحفظ خوراک اب صرف عوام کی قوت خرید تک ''محفوظ'' ہے۔

آج کل تحفظ خوراک پر بحث کی اصل وجہ ترقی یافتہ ممالک اور ان کی بین الاقوامی کمپنیوں کے آزاد تجارت کے شکنجے میں زراعت کے شعبے کو جکڑنا اور قوموں کی زرعی تہذیب کو روندنا ہے۔ اس بنیاد پر اب سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جو تحریک شروع کی گئی ہے اس میں تحفظ خوراک کی جگہ حق خودارادیت برائے خوراک کے نعرے نے لے لی ہے۔ حق خودارادیت برائے خوراک عوام، آبادیوں اور ممالک کا وہ حق ہے جس کے تحت وہ اپنی ماہی گیری، زرعی معاش وزمین، پیداوار اور خوراک کے لیے ایسی پالیسیاں مرتب کر سکیں جو ان کی تہذیب وروایات، معاشرہ ومعیشت اور ماحولیات کے لیے سودمند ثابت ہوں۔

پہلی خوراک کانفرنس کے برعکس دوسرے کانفرنس میں بائیوٹیکنالوجی کے زراعت میں استعمال پر اتفاق کیا گیا ہے۔ مسودے کے مطابق ''عالمی ادارہ خوراک و زراعت اور مختلف بین الاقوامی تحقیقی اداروں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ زرعی تحقیق کو فروغ دیں جس میں بائیوٹیکنالوجی بھی شامل ہے''۔[۷] عالمی ادارہ خوراک وزراعت کا بائیوٹیکنالوجی کے زرعی استعمال کی حمایت محفوظ غذا اور عام کسان کے ذریعہ معاش دونوں پر ایک سنگین وار ہے۔ اس وقت دنیا میں بائیوٹیکنالوجی کے ذریعے جو نیا اناج کاشت کیا جارہا ہے یہ جینیاتی تبدیلی کے ذریعے وجود میں لایا گیا ہے۔ جینیاتی تبدیلی سے پیدا ہونے والی فصلیں اور مچھلیاں جی ایم اوز کے نام سے پہچانی جاتی ہیں۔ دنیا بھر میں جی ایم اوز کے خلاف سائنسدان، کسان گروہ، اساتذہ اور شہری آواز بلند کر رہے ہیں۔ جی ایم اوز کے خلاف شدید مزاحمت کو دیکھتے ہوئے یورپ میں جی ایم اوز کی پیداوار اور درآمد پر کئی سخت ضابطے لگائے گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یورپ کے باشندوں کی قوت خرید بہت زیادہ ہے اور وہ منڈی میں فروخت ہونے والی اشیاء کی مخالفت کر کے بین الاقوامی کمپنیوں اور اپنی ریاستوں کے فیصلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس تیسری دنیا کے ممالک اپنی ضروریات کے لیے ترقی یافتہ ممالک کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ یہ ممالک ترقی یافتہ ممالک اور آئی ایم ایف، ورلڈ بینک یا پھر ایشیائی ترقیاتی بینک جیسے اداروں کے اس قدر مقروض ہوتے ہیں کہ ہر شرط ماننے پر مجبور ہیں۔ اس کے علاوہ ترقی پذیر ممالک کی مصنوعات کی منڈی بھی ترقی یافتہ ممالک ہی ہوتے ہیں۔ اس طرح ایک یا دوسرے طریقے سے ترقی پذیر ممالک پر امریکہ جیسی صنعتی اور فوجی طاقت اپنے فیصلے آسانی سے مسلط کروانے میں کامیاب ہوتی ہے۔

دوسری عالمی خوراک کانفرنس میں امریکہ نے اس بات پر شدید اصرار کیا کہ جینیاتی پیداوار سے حاصل کی ہوئی خوراک کو بھوک کے خاتمے کے لیے مرکزی کردار کی حیثیت دینی چاہیے۔ یقیناً امریکہ نے یہ مطالبہ اپنے مفادات کو تحفظ دینے کے لیے کیا تھا۔ یورپ اور دیگر ترقی یافتہ ممالک نے جینیاتی خوراک کی درآمد پر شدید مزاحمت کی ہے۔ اس لیے امریکہ نے جی ایم اوز کی برآمد کے لیے تیسری دنیا کا رخ کیا ہے۔ اس سلسلے میں امداد کے طور پر دی جانے والی خوراک ایک کامیاب حربہ ہے۔ امدادی خوراک پروگرام (فوڈ ایڈ پروگرام) کا خوراک کی خودکفالت اور مقامی کسانوں کی روزگار پر منفی اثر مرتب ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ روایتی طرز خوراک وزندگی اور خودانحصاری کی طرف بڑھنے والے اقدامات بری طرح متاثر ہوتے ہیں کیونکہ جن ممالک کو امریکہ خوراک کے طور پر امداد دیتا ہے وہ اس بات کے پابند ہوتے ہیں کہ وہ کسی اور ملک سے یہ اناج درآمد نہیں کر سکتے۔ اس کے علاوہ مال برداری کے لیے امریکی جہاز ہی استعمال کیے

جانے کی شرط ہوتی ہے۔[۸]

ایک اطلاع کے مطابق امریکہ ہر سال تیسری دنیا کو ۲ ملین ٹن جی ایم اوز برآمد کرتا ہے۔ امریکی بین الاقوامی امداد پروگرام (یو ایس اے آئی ڈی) نے ایک بین الاقوامی زرعی کمپنی مونسانٹو کو تقریباً ۳ لاکھ ڈالرز فراہم کیے ہیں تاکہ وہ جینیاتی شکر قندی پر تحقیق کر سکے۔ اس سلسلے میں مونسانٹو کو مزید مدد ورلڈ بینک فراہم کرے گا۔[۹]

مونسانٹو، جینیاتی طور پر تیار کردہ چاول ''سنہرے چاول'' (گولڈن رائس) بچوں میں وٹامن اے کی کمی دور کرنے کے لیے ایک محفوظ غذائی حل کے طور پر پیش کر رہی ہے۔ تیسری دنیا کے غذائی حل اور بھوک پر قابو پانے کے لیے جینیاتی پیداوار کا مسلسل ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے اور اسی کو بنیاد بنا کر دوسری عالمی خوراک کانفرنس میں زراعت کے شعبے میں بائیوٹیکنالوجی کے استعمال کی اجازت بھی دے دی گئی ہے، لیکن یہ رائے عام ہے کہ جی ایم اوز نہ صرف انسانی صحت بلکہ ماحولیات اور زراعت کے لیے بھی نقصاندہ ہو سکتے ہیں۔ جی ایم اوز پر ایک اعتراض قیمت کے حوالے سے بھی کیا جاتا ہے مثلاً مونسانٹو کا تیار کردہ سنہرا چاول اتنا مہنگا ہے کہ عام انسان کے قوت خرید سے باہر ہے۔

تحفظ خوراک کا حل صرف حق خودارادیت میں پوشیدہ ہے۔ جب تک کسی علاقہ کے باشندوں کو یہ فیصلہ کرنے کی آزادی حاصل نہیں ہوگی کہ وہ زرعی پیداوار اپنی خوراک کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے کریں، تحفظ خوراک کا حصول ایک خواب ہی رہے گا۔ روایتی طریقہ زراعت تحفظ خوراک اور ماحول دونوں کے لیے سازگار مانا جاتا ہے۔ یہ یقیناً آزاد تجارت پر یقین رکھنے والوں کی سازش تھی کہ عالمی کانفرنس میں بائیوٹیکنالوجی کی تو اہمیت تسلیم کر لی گئی لیکن روایتی طریقہ زراعت کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

ان وجوہات کی بناء پر کانفرنس میں شریک عوامی گروہوں نے کانفرنس کے مسودے کو یکسر مسترد کیا اور کہا کہ یہ مسودہ اصل میں بھوک بڑھانے، آزاد تجارتی پالیسیوں کو فروغ دینے اور اس کو عالمی سطح پر رائج کرنے کی طرف ایک قدم ہے۔ ان اقدامات کے نفاذ کو ممکن بنانے کے لیے فوجی قوت استعمال کی جا سکتی ہے۔ عوامی گروہوں کا خیال تھا کہ ان پالیسیوں کے برعکس عوامی مفاد کو مدنظر رکھ کر بھی پالیسیاں رائج کی جا سکتی ہیں، جس سے عوام کے وقار، ذریعہ معاش اور بہتر طرز زندگی کی حفاظت کی جا سکے۔ ان گروہوں کے نزدیک صرف حق خودارادیت برائے خوراک ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس کے تحت اقوام اور انسانی گروہوں کو ایک پر وقار زندگی میسر ہو سکتی ہے۔ اس طرز زندگی کے حصول کے لیے ورلڈ بینک، آئی ایم ایف اور ڈبلیو ٹی او اور ترقی یافتہ ممالک کی آزاد تجارتی پالیسیوں کی سخت مخالفت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ عوامی گروہوں نے اس بات پر زور دیا کہ زراعت کے شعبے کو ڈبلیو ٹی او سے مکمل طور پر باہر کر دیا جائے۔ جینیاتی انجینئرنگ کا خاتمہ کیا جائے اور جی ایم اوز سے تیار کردہ اناج کو امدادی خوراک کے طور پر دینے کا سلسلہ بند کر دیا جائے۔ عراق اور کیوبا پر خوراک کی بندش، فلسطین پر غیر قانونی قبضہ اور عوامی تحریکوں پر پابندیوں کے خلاف بھی آواز اٹھائی گئی۔

عالمی خوراک کانفرنس اور این جی اوز کی متوازی کانفرنس (فورم حق خودارادیت برائے خوراک) میں شرکت کی غرض سے دنیا بھر کی تنظیمیں روم، اٹلی آئی تھیں۔ ان میں سے ایک تنظیم پیسٹی سائیڈ ایکشن نیٹ ورک برائے ایشیاء و بحرالکاہل (پین اے پی) نے ایشیائی ممالک کی کئی تنظیموں کو ایک مرکز پر اکھٹا کیا تھا۔ ان میں بنگلہ دیش، پاکستان، ہندوستان، ملیشیا اور فلپائن کے علاوہ کئی ممالک کی تنظیمیں شامل تھیں۔ ان تنظیموں کی طرف سے پین اے پی نے ایک مشترکہ بیان کانفرنس کے میزبان ادارہ برائے خوراک و زراعت کو پیش کیا جس میں مختلف مطالبات درج تھے۔ سرفہرست مطالبہ یہ تھا کہ ڈبلیو ٹی او کو زراعت سے باہر نکالا جائے۔ اس کے علاوہ حق خودارادیت برائے خوراک کو ایک یقینی عمل بنانے کا مطالبہ کیا گیا۔ پین اے پی کے پلیٹ فارم سے شرکت کرنے والی فلپائن اور نیپال کی ہاری تنظیموں کا کہنا تھا کہ ہمارے ہاری دن رات محنت کرنے کے باوجود اپنے لیے بہتر روزی کا بندوبست کرنے سے قاصر ہیں اور قحط کے شکار ہوتے جا رہے ہیں۔

مکمل حقائق کا سامنا کرتے ہوئے اس میں کوئی شک نہیں کہ عوامی گروہوں کے نعرے ''ڈبلیو ٹی او کو زراعت سے باہر نکالو'' کے بغیر بھوک کا خاتمہ ناممکن ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ایف اے او، آئی ایف اے ڈی، ورلڈ فوڈ پروگرام، ریوڈیوسنگ پاورٹی اینڈ ہنگر: دی کریٹیکل رول آف فائیننسنگ فور فوڈ، ایگریکلچر اینڈ رورل ڈیولپمنٹ، ۲۰۰۲ء، صفحہ ۸۔

۲۔ ٹیرا ویوا نمبر ۱، ورلڈ فوڈ سمٹ، ۱۰-۱۳، جون ۲۰۰۲ء، انٹر پریس سروس، صفحہ ۳۔

۳۔ ٹیرا ویوا نمبر ۱، ورلڈ فوڈ سمٹ، ۱۰-۱۳، جون ۲۰۰۲ء، انٹر پریس سروس، صفحہ ۳۔

۴۔ انٹرنیشنل الائنس اگینسٹ ہنگر، مسودہ ورلڈ فوڈ سمٹ، روم، اٹلی، ۱۰-۱۳، جون ۲۰۰۲ء۔

۵۔ کمٹمنٹ ۴، ورلڈ فوڈ سمٹ پلان آف ایکشن، ورلڈ فوڈ سمٹ، روم، اٹلی، ۱۳-۱۷، نومبر ۱۹۹۶ء۔

۶۔ ٹیرا ویوا نمبر ۳، ورلڈ فوڈ سمٹ، ۱۰-۱۳، جون ۲۰۰۲ء، انٹر پریس سروس، صفحہ ۶۔

۷۔ انٹرنیشنل الائنس اگینسٹ ہنگر، مسودہ ورلڈ فوڈ سمٹ، روم، اٹلی، ۱۰-۱۳، جون ۲۰۰۲ء۔

۸۔ الزبتھ براؤ، ورلڈ فوڈ سمٹ: فوڈ ویڈ اینڈ جینی ٹیکلی موڈی فائڈ آرگنیزم، کیتو، جون ۲۰۰۲ء۔

۹۔ الزبتھ براؤ، ورلڈ فوڈ سمٹ: فوڈ ویڈ اینڈ جینی ٹیکلی موڈی فائڈ آرگنیزم، کیتو، جون ۲۰۰۲، صفحہ ۲۱۔

☆ ایک ملین = دس لاکھ = ۱،۰۰۰،۰۰۰

عالمی تجارتی ادارہ اور حق خودارادیت برائے خوراک: راستے جدا جدا!*

عنایت اللہ سہتو

عالمی اور ملکی سطح پر رونما ہونے والی تبدیلیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ عوام کی غذا کا مسئلہ سنگین ہوتا جارہا ہے۔ اگر عالمی منظرنامہ کو دیکھا جائے تو واضح نظر آئے گا کہ سرمایہ دار ادارے ایسی پالیسیاں تشکیل دے رہے ہیں جس سے امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوتا جارہا ہے۔ عالمی تجارتی ادارہ (ڈبلیو ٹی او) کے عالمی زرعی معاہدہ (اے او اے) اور ذہنی ملکیت کا معاہدہ (ٹرپس) مزدور اور چھوٹے کسان کے ذریعہ معاش کے لیے اپنے اندر انتہائی سنگین خطرات سموئے ہوئے ہیں۔

پاکستان کی کل آبادی ۱۴۰ ملین افراد پر مشتمل ہے۔ جس میں سے تقریباً ۷۰ فیصد آبادی یعنی تقریباً ۱۰۰ ملین عوام کے گزر بسر کا انحصار کسی نہ کسی طرح زراعت پر ہے۔ ملک کی کل افرادی قوت کا ۴۴ فیصد زراعت سے منسلک ہے اور عوام کی خوراک کی ضروریات کا ۷۷ فیصد زرعی شعبہ پورا کرتا ہے، باقی ۴۰ ملین لوگ ملک کے دیگر شعبہ جات سے منسلک ہیں اور ۲۳ فیصد کھانے پینے کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔

پاکستان میں غربت کی شرح ۳۸٫۵ ہے۔ ۲۰۰۳ء-۲۰۰۲ء میں ڈیزل، مٹی کا تیل، بجلی اور دیگر ضروری زرعی اشیاء کی قیمتوں میں مزید اضافہ ہوا۔ قیمتوں میں اضافے کے پیچھے آئی ایم ایف، عالمی بینک، ایشیائی ترقیاتی بینک اور مختلف سامراجی اداروں کی پالیسیاں کارفرما ہیں۔ ان پالیسیوں سے یقیناً ان افراد کی زندگی میں بہتری کی کوئی امید نہیں کی جاسکتی جو پہلے ہی غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ گوٹھوں میں رہنے والی کثیر آبادی کا عالم یہ ہے کہ انہیں مشکل سے دو وقت کی روٹی نصیب ہوتی ہے۔ ملک میں ۶۴-۱۹۶۳ کے دوران غربت کی شرح تقریباً ۲٫۴۰ فیصد تھی یعنی آج ۴۰ سال کے بعد بھی غربت کی شرح لگ بھگ وہی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستانی عوام ملکی اور غیر ملکی استحصالی پالیسیوں میں کس طرح پسی ہوئی ہے۔[1]

ہماری ریاست نے پہلے جاگیردارانہ نظام اور اب سرمایہ دارانہ نظام کو سہارا دیا ہے جس سے عوام کے معیار زندگی میں بہتری پیدا ہونے کے تمام راستے بند ہوتے جارہے ہیں۔ ان پالیسیوں کو پرکھنے کے لیے ایک ٹھوس حقیقت پاکستان میں زرعی زمین کی تقسیم ہے۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد سے لیکر آج تک تین دفعہ زرعی اصلاحات کی گئیں ہیں۔ ان اصلاحات کا آغاز ۱۹۵۹ء میں صدر ایوب کی حکومت سے ہوا جس کے تحت ہر جاگیردار اپنے پاس ۵۰۰ ایکڑ آباد اور ۱,۰۰۰ غیر آباد زمین کے علاوہ ۳۶ ہزار پیداواری یونٹ (پی آئی یوز) رکھ سکتا تھا۔ ''جاگیر'' کے خاتمے اور زمین پر کسان کے حق کو تسلیم کرنے اور اسے قانونی تحفظ دینے کا بھی اعلان کیا گیا۔ لیکن زمینداروں کو کئی بہانوں سے زمین رکھنے کے لیے قانونی تحفظ دیا گیا۔ نتیجتاً بہت ہی محدود زمین حکومت کے ہاتھ آئی جس میں ۵۷ فیصد بنجر تھی۔

ملک میں دوسری مرتبہ زرعی اصلاحات ۱۹۷۲ء میں ہوئے۔ جس کے تحت جاگیردار ۱۵۰ ایکڑ آباد اور ۳۰۰ ایکڑ غیر آباد زمین یا پھر ۱۲,۰۰۰ پیداواری یونٹ کے ساتھ ساتھ ٹریکٹر اور ٹیوب ویل کے مالک ۲۰۰۰ پی آئی یوز زمین رکھ سکتا تھا۔ تیسری مرتبہ ۱۹۷۷ء میں زرعی اصلاحات کا اعلان ہوا۔ جس کے تحت ایک جاگیردار ۱۰۰ ایکڑ آباد اور ۲۰۰ ایکڑ غیر آباد زمین رکھ سکتا تھا یا ۸,۰۰۰ پیداواری یونٹ (پی آئی یوز)۔ اسی سال جنرل ضیاء کی فوجی حکومت نے ان اصلاحات کو مکمل طور پر نظرانداز کیا۔[2]

ڈبلیو ٹی او کے تحت عالمی زرعی معاہدے کے مندرجہ ذیل اثرات کی نشاندہی ہوتی ہے:[3]

- معیشت کے حوالے سے ریاستیں ایک دوسرے پر فیصلے مسلط کرسکتی ہیں یا یوں کہہ لیں کہ عالمی زرعی معاہدہ ''معاشی جمہوریت'' پر اثر انداز ہوتا ہے۔
- چھوٹے کسان، خاص کر مزدور کسان عورت کی زرعی پیداوار میں شمولیت اور خوراک تک رسائی مختلف مسائل سے دوچار ہوتی ہیں۔
- کسانوں کے قرضے اور بھوک میں اضافہ ہورہا ہے۔
- مزدور عوام کے لیے زمین سے بے دخلی میں اضافہ اور وسائل تک رسائی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔
- آمدنی اور معاش میں کمی واقع ہوتی ہے اور اس طرح سستی غذا کی فراہمی ہو بھی جائے تو کسان کی پہنچ سے دور ہی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ قیمتوں پر اجارہ داری، نجکاری اور مراعات کے خاتمے کی وجہ سے قیمتوں میں اضافہ ہورہا ہے۔
- بین الاقوامی کمپنیوں کے کردار کو زرعی پیداوار میں بھرپور اور ٹھوس بنیاد فراہم کرتا ہے۔
- ڈبلیو ٹی او سرمایہ داری نظام کے تحت تیسری دنیا کی زراعت کو پسماندہ اور صرف گزر بسر کے قابل سمجھتا ہے اور اس طرح تیسری دنیا کی زراعت جو کہ کاروباری رشتوں سے الگ معیار پر سنواری گئی ہے، کی شکل کو مسخ کردیتا ہے۔ اس حملے کا اصل مقصد بین الاقوامی منڈی اور کاروباری زراعت کو فروغ دینا ہے۔

* چیلنج، کے شمارے جولائی تا دسمبر ۲۰۰۳ء، صفحہ ۵ تا ۷۔

مجموعی طور پر زرعی اصلاحات کو ناکام قرار دیا جاتا ہے۔[۳] سندھ میں مزدور کسان کی صورتحال زیادہ سنگین ہے۔ ۱۹۹۹ء-۱۹۹۸ء میں کل دیہی گھرانوں میں سے سندھ میں ۶۹ فیصد اور پنجاب میں ۵۵ فیصد گھرانے بے زمین تھے۔ اگر سندھ اور پنجاب کا موازنہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ سندھ میں ہاری ۲۲ فیصد جبکہ پنجاب میں ۸ فیصد پائے جاتے ہیں۔ ان اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ زمین کی تقسیم سندھ میں کہیں زیادہ غیر منصفانہ ہے۔[۴] زمین سے بے دخل افراد کو دیگر شعبہ جات میں کھپانے کی صلاحیت بھی نسبتاً کم ہے۔

پاکستان ابھی جاگیردارانہ رشتوں کے شکنجے سے پوری طرح نکلنے بھی نہ پایا تھا کہ حکومت نے سرمایہ دارانہ نظام کے تحت نئے قوانین کا اعلان ''کارپوریٹ فارمنگ'' کے نام سے جون ۲۰۰۲ء میں باقاعدہ طور پر کر دیا جس کے نفاذ کی بازگشت گزشتہ دو سال سے سنائی دے رہی تھی۔ اس دوران حکومت نے بعض عملی اقدامات کر کے اس کے نفاذ کے لیے پہلے ہی راہ ہموار کر دی ہے۔ اس قانون کے تحت بڑی بڑی زرعی بین الاقوامی کمپنیوں کو زرعی زمین ۵۰ سال اور مزید اضافہ کے ساتھ ۴۹ سال کی مدت کے لیے پٹے پر دی جا سکتی ہے۔ حکومت نے ان کمپنیوں کے لیے محصولات میں کمی اور دیگر سہولیات کی فراہمی کا بھی اعلان کیا ہے۔ اس عمل سے خدشہ ہے کہ لاکھوں افراد بے روزگار ہو جائیں گے کیونکہ زیادہ تر کام جدید مشینوں کے ذریعے کیا جائے گا۔ کارپوریٹ فارمنگ سے قبل ہی سرمایہ داری اپنا جال پاکستانی زراعت پر ڈال چکی تھی۔ اس کی ایک مثال سبز انقلاب کے تحت جدید زرعی بیج اور ٹیکنالوجی کا استعمال ہے جس کی وجہ سے نقد آور فصلوں کی کاشت کو فروغ حاصل ہوا۔ نقد آور فصلوں میں کپاس اور گنا سب سے اہم ہیں۔

نقد آور فصلیں: زمیندار و سرمایہ دار کا ذریعہ منافع

کپاس سندھ، پنجاب کے علاوہ اب سرحد اور بلوچستان کے چند علاقوں میں اگائی جاتی ہے۔ اکنامک سروے ۲۰۰۳ء-۲۰۰۲ء کے مطابق کپاس ۶ء۵۳ ملین ایکڑ پر کاشت کی گئی اور اس کی پیداوار ۱۰ الاکھ گانٹھوں سے زیادہ ہے۔[۵] کپاس کو ''چاندی کی ریکھا'' بھی کہا جاتا تھا۔ آج بھی پاکستان کے زرمبادلہ کا ایک کثیر حصہ کپاس کا مرہون منت ہے لیکن اس حقیقت کا ایک روپ یہ بھی ہے کہ کپاس کی کاشت سے مزدور کسان فاقہ کشی کے ساتھ ساتھ موذی بیماریوں کی نظر ہو رہے ہیں۔ کپاس پر کیمیائی کھاد اور زہریلی ادویات کا بے حد استعمال ہوتا ہے جو کہ دونوں ہی مہنگی قیمتوں پر حاصل کی جاتی ہیں۔ ایک طرف ان ادویات اور دیگر زرعی پیداواری اشیاء کی مہنگی قیمتیں کسانوں کو نہ چکانے والے قرض کے دائرے میں دھکیل دیتی ہیں تو دوسری طرف زہریلی ادویات کی وجہ سے مزدور کسان کے ساتھ ساتھ نہ صرف دیہی بلکہ شہری آبادیاں بھی اس موذی شئے کے زیر اثر آتی ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارا ماحول شدید طور پر آلودہ ہو رہا ہے لیکن زرعی کمپنیوں کے منافع جات میں روز بروز اضافہ ہی ایک مکمل حقیقت ہے۔

اس وقت پاکستان میں گنا ایک کثیر رقبے پر اگایا جا رہا ہے، جن میں سندھ اور پنجاب کے علاوہ سرحد کے کچھ میدانی علاقے شامل ہیں۔ پاکستان میں شکر کے ۷۶ کارخانے ہیں جو کاشت کاروں سے کم قیمت پر گنا خرید کر ۵۰ ملین ٹن سے زائد چینی تیار کرتے ہیں۔ حکومت گنے کے کارخانے کے سرمایہ داروں کو چھوٹ تو فراہم کرتی ہے لیکن گنا کاشت کرنے والا چھوٹا مزدور کسان پیداواری لاگت بھی مشکل سے ہی کما پاتا ہے۔

اہم غذائی فصلیں

گندم، چاول، مکئی، سبزیاں دیگر غذائی فصلیں خوراک جیسی بنیادی ضرورت کو پورا کرتی ہیں لیکن سرمائے کی تلاش میں جاگیردار اور سرمایہ داران فصلوں کی اہمیت کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ پاکستان میں زرعی زمین کا بڑا حصہ زمینداروں کی ملکیت ہے۔ اس طرح مزدور کسان چاہے بھی تو ان غذائی فصلوں کو کاشت نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت پاکستان اعتراف کرتی ہے کہ پاکستان کی ۳۰ فیصد آبادی غذائی ضروریات کے حوالے سے غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہی ہے۔

گزشتہ چند سالوں میں ڈیزل اور پٹرول کی قیمتیں کئی گنا بڑھ چکی ہیں۔ ۱۹۹۹ء سے لیکر اب تک صرف ڈیزل کی قیمت میں ۱۱۳ فیصد اضافہ ہوا اور اسی دورانیہ میں مٹی کے تیل کے نرخوں میں تقریباً ۱۴۰ فیصد اضافہ ہوا۔ پانی، زرعی آبپاشی کا اہم جز ہے۔ اس وقت پاکستان کے دیگر علاقوں کی طرح سندھ کے گوٹھوں میں پانی کی شدید کمی ہے۔ نہری پانی سال میں بمشکل تین مہینے میسر ہوتا ہے۔ سال کے باقی مہینے ہاری ڈیزل مشینوں کے ذریعے ٹیوب ویل چلا کر فصلوں کو سیراب کرتے ہیں۔ ایک ایکڑ زمین کو ایک مرتبہ پانی دینے کا خرچہ ۵۰۰ روپے ہے۔

فصلوں کے بیج

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ فصلوں کے بیج ہاری اور کسان ہی کی محنت کا نتیجہ اور ملکیت ہیں۔ لیکن عالمی منظر نامے پر نظر دوڑانے سے پتہ چلتا ہے کہ ترقی یافتہ ممالک نے ڈبلیو ٹی او جیسے ادارے بنا کر ان کے زیر سایہ ذہنی ملکیت کا معاہدہ (ٹرپس)، عالمی زرعی معاہدہ (اے او اے)، معاہدہ برائے خدمات (گیٹس) اور دیگر مزدور کسان دشمن معاہدے تشکیل دیے ہیں۔ ان معاہدوں میں بیج کے حوالے سے ٹرپس معاہدہ خاص طور پر اہمیت کا حامل ہے۔ ٹرپس کے تحت زرعی فصلوں کے بیج اور اس میں استعمال ہونے والی اہم اشیاء کو بڑی بڑی بین الاقوامی کمپنیاں اپنی ملکیت بنا رہی ہیں۔ جس سے پاکستان جیسے کئی ترقی پزیر اور غریب زرعی ممالک کے لاکھوں کروڑوں ہاری و کسان اپنی فصلوں کی بیج سے بھی محروم ہو جائیں گے۔ یہ کمپنیاں پاکستان میں کارپوریٹ فارمنگ آرڈیننس اور پلانٹ بریڈرز رائٹس ایکٹ (جو کہ ٹرپس معاہدے کو سامنے رکھ کر پاکستان میں تشکیل دیئے جا رہے ہیں) کے تحت بیجوں پر حق ملکیت تسلیم کروانے کے بعد اپنی مرضی سے فصل اگائیں گی۔ یاد رہے کہ زرعی بین الاقوامی کمپنیوں کی ریت ہے کہ وہ نقد آور فصلوں کو غذائی فصلوں پر فوقیت دیتی ہیں۔ ایک طرف مزدور کسان و ہاری اپنی روزی، گھر بار اور

طرز زندگی سے محروم ہو جائیں گے تو دوسری طرف عوام ناکافی خوراک اور فاقہ کشی کا شکار ہوگی۔ بین الاقوامی کمپنیوں کی بیج پر گرفت کو سمجھنے کے لیے سویابین بیج کا حوالہ دینا مناسب ہوگا۔

سویابین کے بیج پر حق ملکیت ایگراسیٹس (Agracetus) کمپنی کے پاس تھی۔ایک اور زرعی کمپنی مونسانٹو نے اس حق ملکیت کی سخت مخالفت کی اور ایگراسیٹس کے خلاف چلنے والی تحریک میں ایک اہم فریق کا کردار ادا کیا،لیکن بعد میں مونسانٹو نے خود ہی اس کمپنی کو خرید لیا! کمپنی کے اثاثہ جات میں سویابین بیج پر حق ملکیت یعنی ''پیٹنٹ'' بھی شامل تھا۔اب مونسانٹو نے اپنی پالیسی بدلی ہے اور اسی پیٹنٹ کے دفاع میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے۔

بیج تیار کرنے والی بین الاقوامی کمپنی مونسانٹو دنیا بھر میں سویابین کے بیج کی کاشت پر اجارہ داری حاصل کر چکی ہے۔ ۶ مئی ۲۰۰۳ء کو یورپین پیٹنٹ آفس (ای پی او) نے فیصلہ سنایا کہ ۱۹۹۴ء میں مونسانٹو کا سویابین کے جینیاتی طور پر تیار کردہ بیج سے متعلق حاصل کیا گیا پیٹنٹ برقرار ہے۔اس فیصلے کے نتیجے میں دنیا بھر میں سویابین کے ہر قسم کی جینیاتی بیج کی تیاری اور کاشت کے حقوق مونسانٹو کو حاصل ہو گئے ہیں۔اب اس بیج کی تیاری کے لیے مونسانٹو سے پیشگی اجازت کے ساتھ ساتھ مسلسل رائلٹی (یعنی ایک طرح کا ٹیکس) بھی ادا کرنا ضروری ہے۔بیج کی تیاری اور کاشت سے لیکر اس سے متعلق ہر طرح کی تحقیق کے حقوق بھی مونسانٹو نے حاصل کر لیے ہیں۔مونسانٹو، پاکستان کے بازاروں میں بھی کھلے عام بیج کا کاروبار کر رہی ہے۔اسی سازش کی ایک کڑی کچھ یوں ہے کہ قومی بیج فراہم کرنے والے اداروں کو بند کیا جا رہا ہے۔مثال کے طور پر سندھ سیڈ کارپوریشن کے خاتمہ کی بات ہو رہی ہے جو کہ صوبے میں مناسب قیمتوں پر تصدیق شدہ بیج منڈی تک پہنچانے کا ذمہ دار تھا۔اب کئی غیر ملکی کمپنیاں منہ مانگی قیمتوں پر بیج فروخت کر رہی ہیں۔

پاکستان میں دو رخی پالیسیوں کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ پنجاب سیڈ کارپوریشن کے خاتمے کا ارادہ فی الحال ملتوی کر دیا گیا ہے۔پنجاب کے مزدور کسانوں کے حوالے سے یہ ایک بہتر فیصلہ ہے لیکن ایسے ہی اقدامات سندھ اور پورے پاکستان کے مزدور کسانوں کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر اٹھانے کی ضرورت ہے۔

حق خودارادیت برائے خوراک

موجودہ حالات سے واضح ہوتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام اور اس کے خاص ماتحت ادارے ڈبلیو ٹی او میں زرعی حوالے سے تشکیل کردہ معاہدے اور پالیسیاں دنیا بھر کی عوام کے لیے قطعاً موزوں نہیں۔ عالمی سطح پر ان حالات کے تحت تحفظ خوراک کی پالیسی پر کام ہو رہا ہے۔ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ تحفظ خوراک فراہم کرنے کی امید دراصل ریاست سے کی جاتی ہے جو کہ پدرانہ سوچ پر مبنی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ غذائی ذخائر،اس کی تقسیم وخیرات کے علاوہ غذایت اور ثقافتی پسند پر توجہ دے۔اس طرح اگر ریاست خوراک کو دیگر ممالک سے درآمد کر کے عوام تک پہنچا دے تب بھی وہ اپنی ذمہ داری سے عہدہ براہ ہونے میں کامیاب ہو سکتی ہے۔یقیناً تحفظ خوراک کا بنیادی خیال عوام کے لیے ذریعہ معاش اور بہتر آمدنی کی یقینی فراہمی نہیں ہے اور اس طرح عوام اپنی ضروریات کو حق خودارادیت کی بنیاد پر حاصل کرنے سے محروم رہ جاتی ہے۔

تحفظ خوراک کی بنیاد پر قومی سطح پر لاکھوں کسان اپنی روزی بہرحال گنوا دیں گے۔اس کے علاوہ خوراک انسانی ثقافت کا ایک بنیادی حصہ بھی ہے جسے بین الاقوامی کمپنیوں کے حوالے نہیں کیا جا سکتا ہے۔زرعی پیداوار میں ایک عام کسان کے کردار، معیشت اور ثقافت کے تناظر میں ''تحفظ خوراک'' کی اصطلاح ناکافی ہے۔ اس خیال کی کمزوریاں عالمی تجارتی ادارے کے تحت عالمی زرعی معاہدہ کے نافذ ہونے سے مزید کھل کر سامنے آئی ہیں مثلاً عالمی زرعی معاہدہ کے تحت مندرجہ ذیل اثرات کی نشاندہی ہوتی ہے:[۶]

- معیشت کے حوالے سے ریاستیں ایک دوسرے پر فیصلے مسلط کر سکتی ہیں یا یوں کہہ لیں کہ عالمی زرعی معاہدہ ''معاشی جمہوریت'' پر اثر انداز ہوتا ہے۔
- چھوٹے کسان، خاص کر مزدور کسان عورت کی زرعی پیداوار میں شمولیت اور خوراک تک رسائی مختلف مسائل سے دوچار ہوتی ہیں۔
- کسانوں کے قرضہ اور بھوک میں اضافہ ہو رہا ہے۔
- مزدور عوام کے لیے زمین سے بے دخلی میں اضافہ اور وسائل تک رسائی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہیں۔
- آمدنی اور معاش میں کمی واقع ہوتی ہے اور اس طرح سستی غذا کی اگر فراہمی ہو بھی جائے تو کسان کی پہنچ سے دور ہی رہتی ہے۔اس کے علاوہ قیمتوں پر اجارہ داری، نجکاری اور مراعات کے خاتمے کی وجہ سے قیمتوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔
- بین الاقوامی کمپنیوں کے کردار کو زرعی پیداوار میں بھرپور اور ٹھوس بنیاد فراہم کرتا ہے۔
- ڈبلیو ٹی او سرمایہ داری نظام کے تحت تیسری دنیا کی زراعت کو پسماندہ اور صرف گزر بسر کے قابل سمجھتا ہے اور اس طرح تیسری دنیا کی زراعت جو کہ کاروباری رشتوں سے الگ معیار پر سنواری گئی ہے، کی شکل کو مسخ کر دیتا ہے۔اس حملے کا اصل مقصد بین الاقوامی منڈی اور کاروباری زراعت کو فروغ دینا ہے۔

اوپر درج کیے گئے نکات سے ظاہر ہوتا ہے کہ تحفظ خوراک ڈبلیو ٹی او کی پالیسیوں اور معاہدوں کے زد میں آ کر بری طرح ''گھائل'' ہو چکا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ڈبلیو ٹی او اور اقوام متحدہ کے دیگر ذیلی ادارے تحفظ خوراک کو سہارا دینے کی خاطر گاہے بگاہے مختلف قسم کی پالیسیاں پیش کرتے رہتے ہیں۔ان پالیسیوں میں ''بریڈ باکس، ڈیولپمنٹ باکس'' اور آئی ایم ایف کے ذریعے غذائی امداد کی مثالیں موجود ہیں۔ یہ ادارے دراصل یہ باور کرانے کی کوشش میں ہیں کہ آزاد تجارت کے تحت بھی تحفظ خوراک ممکن ہے۔

تحفظ خوراک پر مبنی پالیسیاں بھی زراعت میں بین الاقوامی کمپنیوں کو بھرپور کردار فراہم کرتی ہیں۔لیکن اس نظام کے زیر سایہ زرعی پیداوار میں سب سے زیادہ استحصال مزدور کسان کا ہوگا۔کیونکہ سرمایہ داری کی بنیاد ہے کم سے کم اجرت پر زیادہ سے زیادہ پیداوار۔دوسرا یہ کہ کمپنیاں جدید کیمیائی و مشینی طریقہ کاشت سے شدید ماحولیاتی نقصانات کی ذمہ دار ہوں گی۔ان سب خامیوں کے باوجود بھی ضروری نہیں ہے کہ تحفظ خوراک کا مسئلہ لوگوں کی ثقافتی اور مذہبی خواہشات کے عین مطابق پورا ہو سکے گا۔

ان مسائل کی بنیاد پر دنیا بھر کے مزدور کسان اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ خوراک کے مسئلہ کو عالمی اداروں اور بین الاقوامی کمپنیوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔اس بنیاد پر خاص کر کے ایشیاء کی کچھ عوام دوست تحریکوں اور تنظیموں نے ایک متبادل اصطلاح وضع کی ہے جو کہ ''حق خودارادیت برائے خوراک'' کے نام سے جانی جاتی ہے۔

اس اصطلاح کے کچھ بنیادی اصول ہیں جس کے مطابق حق خودارادیت برائے خوراک یا ''فوڈ سورینٹی'' کا تعلق عوام سے ہے اور غذا عوام کا بنیادی حق ہے۔یہ حق اس حق کو بھی جنم دیتا ہے کہ عوام کی غذائی پیداوار اور خوراک تک رسائی میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ان حالات میں جب کہ سرمایہ دارانہ نظام (یا آج کل کی زبان میں گلوبلائیزیشن) ہر عوامی حق پر حملہ آور ہو رہا ہے، عوامی جدوجہد کے دائرے میں حصول خوراک بھی شامل ہو جاتا ہے۔حق خودارادیت برائے خوراک کی بنیاد حقوق کے سوال پر ہے۔یعنی غذا، انتخاب، غذائیت، پیداوار، وسائل رسائی وہ تمام حقوق ہیں جو اس نعرے کے زیر سایہ ہیں۔ان تمام حقوق کی ضمانت لازمی ہے اور یہ ضمانت اسی وقت ممکن ہے جب عوام ان حقوق کو جدوجہد کے ذریعے حاصل کریں۔دوسرے الفاظ میں ان تمام حقوق کی بنیاد ''حق خودارادیت برائے خوراک'' کے حوالے سے متعارف کرائی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ عوام کے حقوق میں یہ بھی شامل ہے کہ ان کے پاس ذریعہ آمدنی اور قابل گزارا آمدنی حاصل کرنے کے ذرائع موجود ہوں۔ہنگامی حالات میں عوام کا یہ بھی حق ہے کہ ان کو غذا فراہم کی جائے۔معاشرتی اور قومی حق خودارادیت کہتی ہے کہ قومی غذائی پیداوار ہر پالیسی پر فوقیت رکھتی ہے۔یعنی غیر منصفانہ مقابلہ، سرمایہ سرکاری اور برآمدی فصلوں جیسی تدبیروں کو رد کیا جاتا ہے۔

یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ وہ کونسے گروہ ہیں جو حق خودارادیت برائے خوراک کے نظریے سے جدا ہیں؟ یہ وہ ہیں جو کہ تحفظ خوراک کا نعرہ لگاتے ہیں۔دراصل یہ گروہ یا تو موجودہ حالات کو بدلنا نہیں چاہتے یا ریاست کے پدرانہ کردار پر فی الوقت سوال نہیں اٹھاتے بلکہ موجودہ ڈھانچے میں ہی اصلاحات تجویز کرتے ہیں۔

ڈبلیو ٹی او کے مختلف معاہدے جو زرعی شعبے سے جڑے ہوئے ہیں، حق خودارادیت برائے خوراک کی مکمل طور پر نفی کرتے ہیں۔پاکستان میں اس سوچ کی مکمل نفی کارپوریٹ فارمنگ آرڈیننس کے نافذ ہونے سے ہو رہی ہے۔یہ قانون بین الاقوامی زرعی کمپنیوں کو کئی حوالوں سے مکمل تحفظ فراہم کرتا ہے: ۱۰۰ فیصد منافع جات رکھنے کا انتظام، محصولات میں چھوٹ، ۹۹ سال کے لیے زرعی زمین کی لیز و دیگر۔اس کے علاوہ پلانٹ بریڈرز رائٹس ایکٹ کے تحت بین الاقوامی کمپنیوں کو بیج پر ذہنی ملکیت کا حق دینے کی طرف پیش رفت جاری ہے جو کہ ٹرپس کا ایک اہم پہلو ہے۔معاہدہ برائے خدمات (گیٹس) کے تحت زرعی آبپاشی کا نظام بھی بین الاقوامی کمپنیوں کے حوالے کیے جانے کے امکانات موجود ہیں۔یہ سارے منصوبے سرمایہ داری نظام کے تحت بنائے جا رہے ہیں اور ان کی بنیاد منافع کا حصول ہے۔یقیناً ان میں سے کوئی ایک پالیسی بھی ایسی نہیں ہے جو کہ چھوٹے کسان اور مزدور کے معاشی و معاشرتی حقوق کا تحفظ کرے۔

ایسے ہی کچھ حالات نہ صرف پاکستان میں بلکہ ایشیاء کے علاوہ دیگر براعظموں میں بھی پائے جاتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اب مزدور کسان اس نعرے کو ایک عزم سے لے کر چلا ہے کہ ''ڈبلیو ٹی او کو زراعت سے باہر نکالو'' اس سوچ کے تحت عوامی گروہوں نے ایک مسودہ تیار کرنا شروع کیا ہے جو کہ ''حق خودارادیت برائے خوراک کنونشن'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس زیر غور مسودے کی تیاری کی بنیاد مندرجہ ذیل نکات پر کی جا رہی ہے:۷

۱۔ مختلف انسانی حقوق میں غذا سب سے زیادہ بنیادی حق ہے۔اس حق کو حاصل کر کے ہی دنیا سے غذائی کمی اور بھوک کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ اگر ہم اس حق کو تسلیم کر لیتے ہیں تو پھر یقیناً یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ خوراک کی پیداوار پر خود اختیاری بھی ایک حق ہے۔اس طرح پیداواری وسائل جس میں زمین، پانی، بیج اور دیگر ضروریات شامل ہیں، پر مزدور کسان کا مکمل اختیار ہونا لازمی ہے۔

۳۔ حقوق کو تسلیم کرنا ہی کافی نہیں بلکہ اس کی تکمیل بھی لازمی ہے۔اس طرح عوام اور کسان آبادیوں کو یہ حق حاصل ہے کہ خوراک سے منسلک ضروریات اور خوراک کے حصول اور پیداوار سے جڑے ہوئے معاشی، معاشرتی، ثقافتی اور سیاسی حقوق پر مکمل اختیار حاصل کر سکیں۔

حوالہ جات:

۱۔سوشل پالیسی اینڈ ڈیولپمنٹ سینٹر، سوشل ڈیولپمنٹ ان پاکستان، اینول ریویو ۲۰۰۱ء، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۲۰۰۲ء، صفحہ ۵۱۔

۲۔ایس اکبر زیدی، ایشوز ان پاکستانز اکانومی، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۰ء، صفحہ ۲۸۔

۳۔ایضاً، صفحہ نمبر ۳۱۔

۴۔سوشل پالیسی اینڈ ڈیولپمنٹ سینٹر، سوشل ڈیولپمنٹ ان پاکستان، اینوئل ریویو ۲۰۰۱ء، صفحہ ۴۷۔

۵۔ ڈان، ۶، جون ۲۰۰۳ء۔

۶۔گزمن، روزاریو بیلا۔اوورویو آف فوڈ سورینٹی کمپین۔جو کہ پیش کیا گیا وومن اینڈ انوائرمنٹ ٹاسک فورس منگ میں، کیسٹ سرٹ یونیورسٹی، بنکاک، ۲۱، جون ۲۰۰۳ء۔

۷۔ پین اے پی اور آئی بان۔کانسیپٹ پیپر آن فوڈ سورینٹی کنونشن، ۲۰۰۲ء۔

ہوشیار..... مضر صحت سویابین تیل کی امریکہ سے درآمد*

جینیاتی بیج اور اس سے تیار شدہ مصنوعات کے خلاف دنیا بھر میں سائنسدان، محققین، صحت، ماحولیات اور کسانوں کے اداروں کے علاوہ سماجی اور سیاسی تنظیمیں جدوجہد کررہی ہیں۔اس کاروبار سے ترقی یافتہ ممالک کی بڑی بڑی کمپنیاں منسلک ہیں، جس کی وجہ سے انسانی صحت اور ماحول کے لیے مضر جینیاتی فصلیں اور ان سے تیار کردہ مصنوعات امریکہ اور دیگر ممالک میں بڑے پیمانے پر تیار اور برآمد کی جاتی ہیں۔ ٹریڈنگ کارپوریشن آف پاکستان (ٹی سی پی) نے دس ہزار ٹن سویابین سے حاصل شدہ کھانے کے تیل کی فروخت کے لیے ٹینڈر طلب کیے ہیں۔ یہ تیل حال ہی میں امریکہ نے پاکستان کو ایک خوراک مدد پروگرام ۴۱۶ (بی) کے تحت دیا ہے۔ جینیاتی طور پر کاشت کیے گئے سویابین سے تیار کردہ تیل کے بارے میں خدشہ ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ انسانی صحت کے لیے مضر ہوسکتا ہے۔ امریکہ میں جینیاتی طور پر کاشت کی ہوئی فصلیں کثرت سے پیدا کی جاتی ہیں، اس لیے امریکہ دنیا بھر میں امداد کے طور پر جو بھی خوراک فراہم کررہا ہے اس کے بارے میں شکوک وشبہات بڑھ گئے ہیں۔

حکومت پاکستان کے امریکہ سے سویابین تیل کی درآمد اور اس کے مضر اثرات کے خلاف زرعی پالیسی ریسرچ اور آگہی مرکز حیدرآباد نے ۷، جولائی ۲۰۰۲ء کو سیکریٹری زراعت، حکومت پاکستان کو ایک خط لکھا جس میں امریکہ سے درآمد کیے جانے والے سویابین کے بارے میں کئی خدشات کا ذکر کیا گیا ہے جس میں سے ایک اس تیل کے خلاف عالمی سطح پر صحت کے حوالے سے پائے جانے والے شکوک وشبہات ہیں۔ یہاں ہم اس خط کا خلاصہ پیش کررہے ہیں۔

شعبہ تجزیاتی بائیو کیمسٹری، میکووائرے یونیورسٹی سڈنی کے ڈاکٹر ڈینل جارڈن کے مطابق امریکہ میں تیار کیے جانے والے زیادہ تر سویابین تیل کے لیے جینیاتی طور پر کاشت کی جانے والی اور غیر جینیاتی سویابین کو علیحدہ نہیں کیا جاتا ہے۔ اس بات کی تصدیق بین الاقوامی زرعی کمپنی مونسانٹو اور جینیٹک - آئی ڈی امریکہ بھی کرچکا ہے۔ اس بات کا خدشہ ہے کہ امریکہ سے درآمد شدہ سویابین تیل جینیاتی طور پر تیار کردہ فصل کی پیداوار ہے جس پر ''کھانے کا تیل'' تو تحریر ہے لیکن اس پر ''جی ایم پیداوار'' یعنی ''جینیاتی تبدیلی کے ساتھ کی گئی پیداوار'' کی نشاندہی کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ جی ایم اوز غیر مناسب اور نامعلوم پروٹین پر مشتمل ہوتے ہیں جس کے انسانی صحت پر ناموافق (الرجک) اثرات ممکن ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جی ایم اوز کے خلاف یورپ میں بڑی مہم چلائی جارہی ہے جہاں امریکہ سے آنے والی سویابین کی منتقلی روک دی گئی ہے۔

جینیاتی طور پر تیار کردہ پیداوار کے استعمال کے خلاف جاپان، کوریا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، تھائی لینڈ، انڈیا اور برازیل میں صارفین کی طرف سے شدید مزاحمت کی جارہی ہے۔ ۲۱، اکتوبر ۱۹۹۹ء کو یورپی یونین نے فیصلہ کیا ہے کہ ایسی خوراک جس کا کوئی بھی جز ایک فیصد جی ایم اوز پر مشتمل ہو اس پر جی ایم اوز کا لیبل لگا ہونا ضروری ہے۔ نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا میں بھی ایسا ہی ہے۔ چونکہ جی ایم پیداوار سے انسانی صحت کو درپیش شدید خطرے کا امکان ہے اس لیے شمالی امریکہ سے درآمد شدہ سویابین تیل پر (پاکستان میں) پابندی عائد کی جائے تاوقتیکہ اس کاروبار سے وابستہ افراد یا ادارے (درآمد و برآمد اور تقسیم کنندگان) درکار لیبل کے معیار کو حاصل نہ کرلیں۔ اس معاملہ کو پاکستانی شہریوں کی صحت کو درپیش خطرے کے پیش نظر ترجیحی بنیادوں پر زیر غور لانا چاہیے۔

زرعی پالیسی ریسرچ اور آگہی مرکز حیدرآباد نے شاہدہ جمیل وزیر برائے لیبر، ماحولیات اور دیہی ترقی کو بھی ایک خط مورخہ ۳۰، جولائی ۲۰۰۲ء کو تحریر کیا۔ اس خط میں حکومت کی توجہ انسانی صحت اور ماحولیات پر مضر اثرات کے حوالے سے جینیاتی پیداوار اور ان سے جڑے ہوئے مسائل کی طرف دلائی گئی ہے۔ اس خط کے چند اہم نکات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ جینیاتی تبدیلی والی فصلیں عام فصلوں میں پائے جانے والی جینیاتی (جینز) مواد سے مختلف ہوتی ہیں۔ اس لیے جینیاتی پیداوار کے نتیجے میں حاصل ہونے والی فصلوں کو عام فصل نہیں سمجھا جاسکتا۔

۲۔ جینیاتی فصلوں میں موجود زہریلا مواد انسانی صحت پر سنگین اور دیرپا اثرات مرتب کرسکتا ہے۔

۳۔ ایک جرثومہ (کولی فلاور موزیک وائرس) جو کہ جینیاتی سویابین تیل میں استعمال ہوتا ہے ہیپاٹائٹس بی کے جراثیم سے مناسبت رکھتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ پاکستان میں ہیپاٹائٹس بی کے مرض میں اضافہ امریکہ سے درآمد شدہ جینیاتی سویابین تیل کی وجہ سے ہی ہو۔

۴۔ جینیاتی پیداوار اپنے اندر، ماحول کو متاثر کرنے اور اس میں بگاڑ پیدا کرنے کی خطرناک صلاحیت پوشیدہ رکھتی ہے۔

۵۔ کسی سائنسی تحقیق سے اب تک جینیاتی طور پر تیار کردہ خوراک کے انسانی صحت کو درپیش خطرات کا درست اندازہ نہیں لگایا جاسکا ہے۔

۶۔ حشرات کے خلاف مزاحمت رکھنے والی جینیاتی فصلوں پر انتہائی زہریلی حشرات کش ادویات اسپرے کی جاتی ہیں ان جینیاتی فصلوں میں سویابین بھی شامل ہے

* چیلنج، اپریل تا جون ۲۰۰۲ء، صفحہ ۱۵ تا ۱۶۔

۷۔ بیکٹریا، وائرس، سور یا چوہے کے جینز پر مسلمان مذہبی بنیادوں پر اعتراض کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ہندو اور بدھ مت کے ماننے والے جانوروں کے جینز سبزیوں میں شامل ہونے پر معترض ہو سکتے ہیں مثلاً مسلمان پیپسی کولا میں استعمال ہونے والے پیپسین کے بارے میں تحفظات رکھتے ہیں

۸۔ جینیاتی فصلیں سارے ماحولیاتی نظام کو متاثر کریں گی مثلاً

(الف) فالتو جڑی بوٹیاں کو مزید طاقتور کر دیں گی۔

(ب) دوست کیڑوں اور دیگر اجسام کو تباہ کر دیں گی۔

(ج) قدرتی جینیاتی وسعت جیسے اثاثے کو متاثر کرتی ہوئی اس میں کمی کا باعث بنیں گی۔

(د) روایتی طرز کھیتی باڑی کو نقصان پہنچائیں گی۔

خط کے آخر میں زرعی پالیسی ریسرچ اور آگہی مرکز نے چند تجاویز پیش کی ہیں:

۱۔ جینیاتی فصلوں پر کاروباری سطح کے تحقیقاتی تجربات پر ۵ سال کے لیے پابندی عائد کی جائے اور سائنسی دنیا میں جینیاتی پیداوار پر تحقیق کرنے کے ساتھ ساتھ عوامی سطح پر ان کے استعمال پر بحث و مباحثہ کا اہتمام کیا جائے۔ کاروباری اداروں کی جینیاتی فصلوں پر کی گئی تحقیق کو ہی تصدیق کے لیے کافی نہ سمجھا جائے۔

۲۔ پاکستان میں کاشت کی جانے والی جینیاتی فصلیں مثلاً میر پور خاص، سانگھر اور حیدر آباد میں ہزاروں ایکڑ پر بی ٹی کپاس (جینیاتی کپاس کی ایک قسم) کو بویا جا چکا ہے، ان کو جڑ سے نکال کر پھینک دیا جائے اور پاکستان سے ان کو خارج کرتے ہوئے اس کی کاشت پر پابندی عائد کی جائے۔

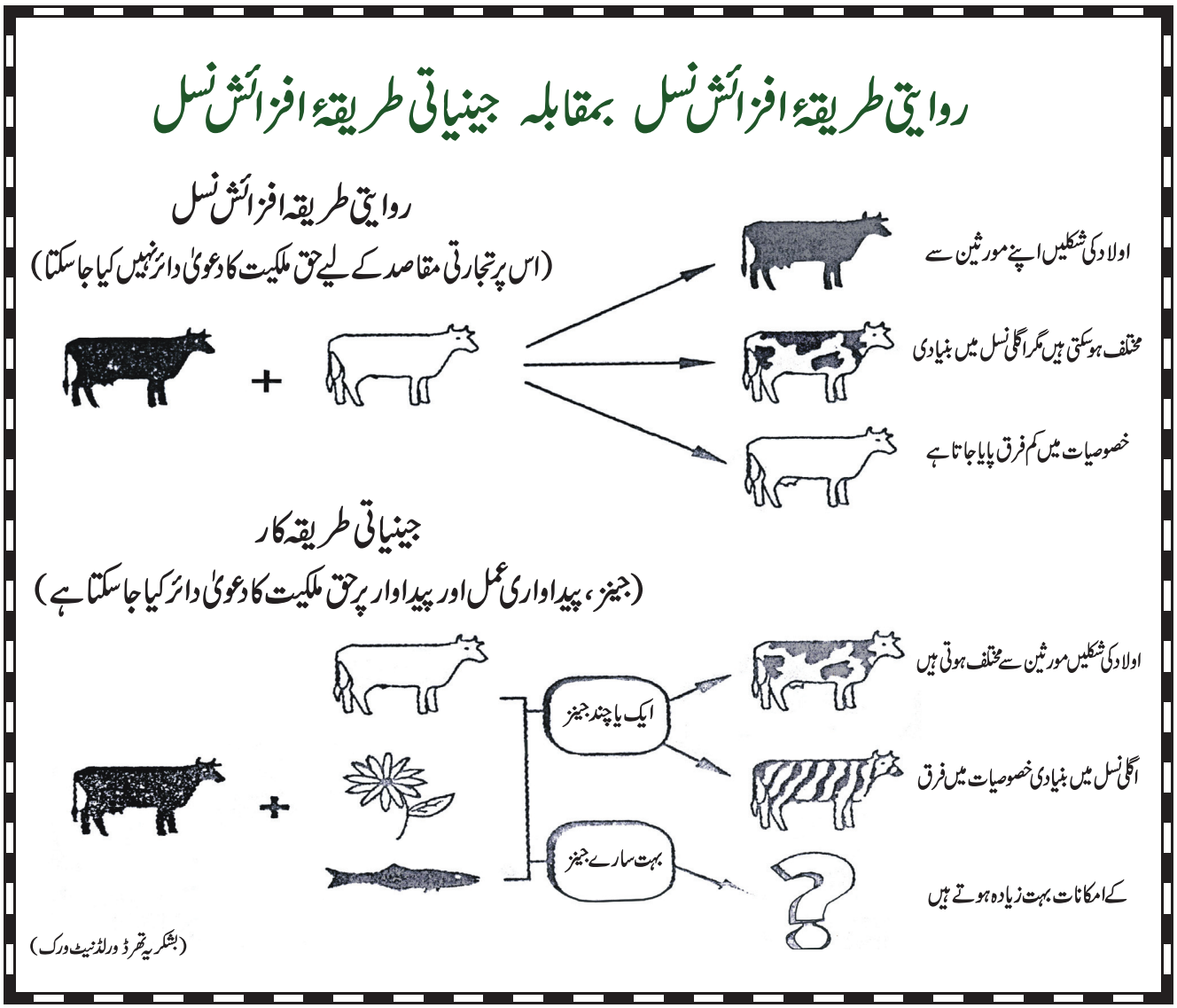

ہم ہیں مونسانٹو*

تلخیص وترجمہ: ساجد حسین خاصخیلی

ہم ہیں مونسانٹو، ہم ہیں مونسانٹو
دیا بچوں کو سرطان، بن کے شیطان سے رحمان
کریں گے ختم اس دھرتی سے، صحت خوراک اور ارمان
قبضے میں لیکر ہر اک جان، بدلیں گے اور بھی
قانون قدرت کے میزان
کہ ہم ہیں مونسانٹو

ڈی ڈی ٹی پر پابندی میں ہمارا کیا تھا قصور
کہ خوراک پر کیڑے مکوڑوں کو مارنا تھا ضرور
تھا یہ اک انقلابی حل، جس پر ہمیں تھا عبور
گر سبزیاں ہوئی زہریلی، تو ہم کیا کریں حضور
کہ ہم ہیں مونسانٹو

گر ہے زہریلا بیج ہمارا، تو ہمارے پاس قانون دان بھی ہیں
صدر سے لیکر ہمارے جیب میں معمولی سیاستدان بھی ہیں
ذریعے پریس اور ٹی وی کے، بچے میاں اور بیوی کے
بدلیں گے جب خیالات، تو ہوگی ہرسو ہماری بات
کہ ہم ہیں مونسانٹو

تمہیں انتخاب نہیں، تمہیں استعمال کرنا ہے
ہو تمہارا ہر نوالا زہر آلودہ، ہمیں یہ کمال کرنا ہے
ہر نئے قانون کے ساتھ، ہوتے ہیں مضبوط میرے ہاتھ
ہیں مالک اس زمانے کے، مگر قصے نہیں یہ سنانے کے
کہ ہم ہیں مونسانٹو

اے مونسانٹو، ظالم مونسانٹو
دیا لوگوں کو سرطان، بن کے
شیطان سے رحمان
کیا ختم اس دھرتی سے صحت،
خوراک اور ارمان
لیکر قبضے میں ہر اک جان، بدلے
قدرت کے میزان

اے مونسانٹو
دھرتی نشینوں کے آزار
کر کے جینیات کا کاروبار
لائے ہو زندگی کو بازار
آنے والی نسلیں
جب کاٹیں گی تیری فصلیں
سوچے گی تجھ کو نفرت سے
دیکھ کر ماحول کو حسرت سے
اے مونسانٹو، ظالم مونسانٹو

* چیلنج، اگست ۲۰۰۱ء، صفحہ ۱۲.

جینیاتی انجینئرنگ اور کاشتکاری کا مستقبل: نقصانات اور اندیشے*

عذرا طلعت سعید

کھیتی باڑی ایک ایسا پیداواری عمل ہے جو ہزاروں سال سے انسانی تہذیب کا ایک بنیادی حصہ رہا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کھیتی باڑی کا عمل عورت نے شروع کیا تھا، جب مرد شکار کے لیے اپنے گروہ سے لمبے عرصہ کے لیے دور چلے جاتے تھے تو عورت روزمرہ کی خوراک کے لیے جنگل سے ایسی جڑی بوٹیاں اور پھل تلاش کرتی جو ان کی غذائی ضروریات کو پورا کر سکے۔ پھر اس نے ان میں سے خوراک کے وہ بیج تلاش کیے جو انسان کی غذا اور صحت کے لیے مفید ثابت ہوں۔

جنوبی ایشیاء میں کھیتی باڑی کا عمل ہزاروں سال سے جاری ہے۔ کسانوں نے اپنے تجربے اور تجزیے سے بہتر سے بہتر اجناس کو پہنچانا اور مختلف بیجوں کو آپس میں ملا کر ان کی کئی اقسام دریافت کیں۔ جن بنیادوں پر بیج چن کر الگ کیے گئے، ان میں خوشبو، ذائقہ، بیماری سے بچنے کی صلاحیت اور کئی طبی خصوصیات شامل ہیں۔ اسی طرح صرف چاول کی دو لاکھ اقسام کے ساتھ ساتھ گندم، جوار اور مختلف قسم کے پھلوں اور سبزیوں وغیرہ کی بھی کئی قسمیں دریافت کی گئیں۔[1] آج تیسری دنیا کا کسان کھیتی باڑی کو ایک طریقہ زندگی کے طور پر اپنائے ہوئے ہے۔ ہمارے دیہات میں ۹۰ فیصد کھیتی باڑی چھوٹا کسان کرتا ہے، جو اپنے خاندان کی کفالت کیلئے خوراک پیدا کرتا ہے، یہی وہ کسان ہیں جنہوں نے صدیوں سے نہ صرف نئے بیج دریافت کیے بلکہ کھیتی باڑی کا ایک ایسا نظام وضع کیا کہ جس سے بیجوں کو نسل در نسل محفوظ رکھا جا سکے۔[2] آج کل جدید سائنسی دور میں ان ہزاروں اقسام کے بیجوں کو دنیا کے بڑے بڑے اداروں میں محفوظ کیا گیا ہے ان میں سے دو ادارے سرفہرست ہیں ایک سی جی آئی اے آر (جو زرعی تحقیق کا بین الاقوامی ادارہ) اور دوسرا آئی پی جی آر آئی (پودوں کی جینیاتی خصوصیت پر تحقیق کرنے والا ایک بین الاقوامی ادارہ) ہے۔ ان اداروں میں پودوں کی جینیاتی خوبیوں کو محفوظ کیا جاتا ہے۔

پچھلی چند دہائیوں سے جب سرمائیدارانہ زراعت کی شروعات ہوئی تو نئے اقسام کے پودوں کی دریافت پر سرمایہ دار نے انفرادی حق ملکیت تسلیم کروانا شروع کیا اس مقصد کے لیے ۱۹۶۱ء میں کنونشن بلایا گیا جو یو پی اووی (UPOV) کے نام سے جانا جاتا ہے یعنی نئے اقسام کے پودوں کے تحفظ کی تنظیم۔

جن نئے پودوں کو دریافت کیا گیا ہے ان میں جینیاتی اشیاء تو وہی ہیں جو صدیوں سے کسان نے دریافت کر کے عام استعمال کے لیے مہیا کیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس پر کسان کی ذہنی ملکیت کے حق کو تسلیم کیا جاتا لیکن یو پی اووی نے اصل میں ان کسانوں کے حق ملکیت کو قانونی تحفظ دیا جو سرمایہ دارانہ طور پر زراعت کے پیشہ سے منسلک ہیں اور فصل کو خوراک نہیں بلکہ منافع کے لیے اگاتے ہیں۔

ذہنی ملکیت پر حق جتانے کا یو پی او وی کنونشن پہلا مرحلہ تھا۔ اس کا دوسرا مرحلہ ٹرپس کے معاہدہ کے ساتھ شروع ہوا جو کہ جینیاتی تبدیلی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اجناس پر زرعی کمپنیوں کی ذہنی ملکیت کا حق تسلیم کرتا ہے۔ ان اجناس کو جی ایم اوز یعنی جینیاتی طور پر تبدیل شدہ اجناس کہا جاتا ہے۔

انسان یا کسی بھی جاندار شئے کے جسم کی بنیادی اکائی خلیہ ہوتا ہے۔ خلیہ کے اندر جینز (genes) ہوتے ہیں جو ڈی این اے (ڈائی اوکسی رائبونیکلو ٹیک ایسڈ) پر مشتمل ہیں۔ جینز زندہ شئے کی موروثی تاریخ اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ یہ جینز ہر انسان کو اپنے والدین سے ملتے ہیں جس میں سے آدھے ماں اور آدھے باپ سے

باسمتی چاول: حقوق بالجبر

برصغیر کے کئی علاقے باسمتی چاول کی وجہ سے پوری دنیا میں مقبول ہیں۔ باسمتی چاول اپنی خوشبو اور ذائقے کی بنا پر ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔ امریکی کمپنی رائس ٹک نے اس نام کی پہچان کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنے کی ایک مجرمانہ کوشش کی۔ رائس ٹک نے برصغیر کے روایتی چاول ''باسمتی'' سے جدید پیوندکاری کے ذریعے ایک ''نئے'' طرز کا باسمتی چاول پیدا کیا جس کو رائس ٹک تین مختلف ناموں جاسمتی، ٹیکسمتی اور کاسمتی کے نام سے مارکیٹ میں فروخت کرنے شروع کیے اس کے ساتھ ساتھ رائس ٹک نے امریکی حکومت کے پیٹنٹ دفتر میں یہ درخواست دائر کر دی کہ اس کو یہ چاول باسمتی کے نام سے فروخت کرنے کی اجازت دی جائے۔

رائس ٹک نے دعوی کیا کہ نئے چاول میں وہ ۲۰ نئی خصوصیات پائی جاتی ہیں، جو روایتی باسمتی میں نہیں ہیں۔ بھارتی حکومت نے رائس ٹک کے اس دعوے کے خلاف امریکہ میں مقدمہ دائر کر دیا، جس میں امریکی عدالت نے رائس ٹک کو لفظ ''باسمتی'' استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اس کے علاوہ جو ۲۰ خصوصیات کا دعوی رائس ٹک نے کیا تھا، ان میں سے صرف ۳ پر اس کے دعوے کو تسلیم کیا گیا۔ بھارتی حکومت نے امریکی عدالت کے اس فیصلے پر شدید ردعمل کا اظہار کیا اور اب پاکستان اور بھارت نے مل کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ دونوں ممالک امریکی عدالت میں اس فیصلے کو چیلنج کریں گے، کیونکہ اگر ۳ خصوصیات پر بھی رائس ٹک کے حق ملکیت کو مانا جائے تو ایک ایسی مثال قائم ہو جائے گی، جس سے مستقبل میں اس طرح کے کئی اور مسائل کھڑے ہونے کا خطرہ موجود رہے گا۔

* چیلنج، اگست ۲۰۰۱ء، صفحہ ۹ تا ۱۱۔

آتے ہیں۔[۳] مثلاً ہر انسان کے لیے اس کے اندر پائے جانے والے جینز اس انسان کا قد، رنگ، بال کا رنگ یا کوئی اور جسمانی و ذہنی خصوصیات کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جو کہ انسان اپنے والدین اور ان کی پچھلی نسلوں سے حاصل کرتا ہے۔ جینز کی منتقلی کا یہ عمل دیگر جانداروں میں بھی اسی طرح ہوتا ہے۔

قدرت میں افزائش نسل ہمیشہ ایک طرح کی انواع میں ہوا ہے۔ یعنی گندم سے گندم پیدا ہوتا ہے، چوہے سے چوہے کا بچہ۔ لیکن جینیاتی انجینئرنگ قدرت کے ان اصولوں کے برعکس ہیں۔ جینیاتی انجینئرنگ میں کسی بھی زندہ شئے سے ڈی این اے یا جنیاتی مواد نکال کر دوسری زندہ شئے میں منتقل کیا جاسکتا ہے۔ یہ عمل ایک ہی جنس کی اقسام کے علاوہ مختلف اجناس کے درمیان بھی ہوسکتا ہے۔ اب انسان، حیوان، پودے اور جراثیم سب جینیاتی اشیاء کے گودام بن چکے ہیں۔ اب ہم کسی بھی جانور کا جینیاتی اجزاء کسی بھی پودے، جراثیم یا انسان میں منتقل کرسکتے ہیں۔ اسی طرح سے کسی بھی پودے کے جینیاتی اجزاء کو کسی بھی دوسرے جاندار شئے میں منتقل کرسکتے ہیں۔ اب قدرتی افزائش نسل کے اصولوں کے برعکس انسان جس طرح چاہے حیاتیاتی زندگی سے کھیلے۔ اس عمل سے پیدا ہونے والی جوئی زندگی دنیا میں جنم لیتی ہے، اس کو جینیٹکل موڈیفائیڈ آرگینزم (جی ایم اوز) کہتے ہیں۔ یعنی جینیاتی تبدیلی کے نتیجے میں جنم لینے والی زندہ شئے۔

مثال کے طور پر ایک جراثیم بیسلیس تھروینجنیس (Bacillus thuringiensis) سے جینیاتی اجزاء نکال کر کپاس کی بیج میں منتقل کیا گیا اور ایک نئی طرح کا بیج بنایا گیا جس کو بی ٹی کاٹن کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جو جینیاتی مواد کپاس میں منتقل کیا گیا ہے اس میں قدرتی طور پر کیڑوں مکوڑوں کو ختم کرنے کی قوت موجود ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس جینیاتی مواد میں قدرتی طور پر زہر موجود ہے۔ بی ٹی کپاس کا یہ فائدہ بیان کیا جاتا ہے کہ کیڑے مار جینیاتی مواد کے استعمال سے کیڑے مار دواؤں کا استعمال کم ہوجائے گا، لیکن تحقیق یہ بتاتی ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ امریکی شعبہ زراعت کے مطابق زرعی دوائیوں کے استعمال میں کل ایک فیصد کمی آئی ہے۔[۴] حالیہ تجربوں سے یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ بیسلیس تھروینجنیس (بی ٹی) کے وہ جنیاتی اجزاء جو کہ کیڑے کو ختم کرنے کا باعث بنتے ہیں وہ پودے کی جڑوں سے ہوکر مٹی میں جذب ہورہے ہیں جس سے زہر زمین میں منتقل ہورہا ہے۔ اس کے علاوہ یہ پودے ایک خاص قسم کی دوست تتلی جسے ''منارک'' کہتے ہیں، کے لیے مہلک ثابت ہورہے ہیں۔ مزید تحقیق یہ ثابت کرتی ہے کہ قدرت میں پائے جانے والے کیڑے مکوڑے اس جینیاتی اجزاء سے نقصان اٹھا رہے ہیں۔ اسی طرح جینیاتی اجزاء کے ردوبدل کے ذریعہ کئی طرح کے نئے اجناس بنائے گئے ہیں مثلاً کپاس کے علاوہ مکئی اور چاول کے بیج اسی طرز پر بنائے گئے ہیں اور بی ٹی مکئی اور بی ٹی چاول کے نام سے موجود ہیں۔

ڈی این اے کا ردوبدل کرنے پر سائنس دانوں کو بہت اعتراض ہے، کیونکہ ڈی این اے خلیے میں ایک خاص ترتیب سے پایا جاتا ہے۔ اس ترتیب کی مفصل وجہ ابھی تک معلوم نہیں ہوسکی ہے۔ جب انسان بغیر سوچے سمجھے اس ترتیب میں تبدیلی لائے گا تو اسکے نقصانات کا تصور بھی اس وقت مشکل ہے۔[۵] کچھ ہی دنوں پہلے یہ معلوم ہوا کہ مونسانٹو کمپنی کے جینیاتی تبدیلی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے سویابین میں اجنبی ڈی این اے کا مواد پایا گیا ہے۔ سائنسدانوں میں بحث جاری ہے کہ اس ڈی این اے نے اپنی مرضی سے جینیاتی تبدیلی کے عمل کے دوران اپنی ساخت کو بدل دیا ہے یا اس تبدیلی کے پیچھے کوئی دوسری نامعلوم وجہ ہے، اب تک یہ ڈی این اے قدرت کے لیے کسی خطرے کا باعث نہیں بنا یا شائد سائنسدان کسی نقصان کو جانچ نہیں سکے ہیں۔[۶]

ایک جراثیم بیسلیس تھروینجنیس (Bacillus thuringiensis) سے جینیاتی اجزاء نکال کر کپاس کی بیج میں منتقل کیا گیا اور ایک نئی طرح کا بیج بنایا گیا جس کو بی ٹی کاٹن کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جو جینیاتی مواد کپاس میں منتقل کیا گیا ہے اس میں قدرتی طور پر زہر موجود ہے۔ بی ٹی کپاس کا یہ فائدہ بیان کیا جاتا ہے کہ کیڑے مار جینیاتی مواد کے استعمال سے کیمیائی کیڑے مار دواؤں کا استعمال کم ہوجائے گا، لیکن تحقیق یہ بتاتی ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ امریکی شعبہ زراعت کے مطابق زرعی دوائیوں کے استعمال میں کل ایک فیصد کمی آئی ہے۔[۴] حالیہ تجربوں سے یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ بی ٹی کے وہ جینیاتی اجزاء جو کہ کیڑے کو ختم کرنے کا باعث بنتے ہیں وہ پودے کی جڑوں سے ہوکر مٹی میں بھی جذب ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ پودے ایک خاص قسم کی دوست تتلی جسے ''منارک'' کہتے ہیں، کے لیے مہلک ہے۔ جینیاتی اجزاء کے ردوبدل کے ذریعہ کئی طرح کے نئے اجناس بنائے گئے ہیں مثلاً کپاس کے علاوہ مکئی اور چاول کے بیج اسی طرز پر بنائے گئے ہیں۔

ڈی این اے کا ردوبدل کرنے پر سائنس دانوں کو بہت اعتراض ہے، کیونکہ ڈی این اے خلیے میں ایک خاص ترتیب سے پایا جاتا ہے۔ اس ترتیب کی مفصل وجہ ابھی تک معلوم نہیں ہوسکی ہے۔ جب انسان بغیر سوچے سمجھے اس ترتیب میں تبدیلی لائے گا تو اسکے نقصانات کا تصور بھی اس وقت مشکل ہے۔[۵] یہ معلوم ہوا ہے کہ جینیاتی تبدیلی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے سویابین میں اجنبی ڈی این اے کا مواد پایا گیا۔ سائنسدانوں میں بحث جاری ہے کہ اس ڈی این اے نے اپنی مرضی سے جینیاتی تبدیلی کے عمل کے دوران اپنی ساخت کو بدل دیا ہے یا اس تبدیلی کے پیچھے کوئی دوسری نامعلوم وجہ ہے، اب تک یہ ڈی این اے قدرت کے لیے کسی خطرے کا باعث نہیں بنا یا شائد سائنسدان کسی نقصان کو جانچ نہیں سکے ہیں۔[۶]

جینیاتی انجینئرنگ کا علم ابھی بہت بنیادی سطح پر ہے، یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر کے سائنس دانوں نے جی ایم اوز کو کھلے عام کھیتی باڑی کے عمل میں استعمال کرنے پر سخت تشویش کا اظہار کیا ہے۔ خطرہ یہ ہے کہ جینیاتی تبدیلی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی زندگی اور عام جانداروں کے درمیان افزائش نسل کے عمل کے نتیجے میں جوئی پود پیدا ہوگی، اس میں کچھ ایسی تبدیلی نہ ہو، جو عام جانداروں پر حاوی ہوکر نظام قدرت میں تباہی یا بگاڑ کا باعث بنے۔

جینیاتی انجینئرنگ کا علم ابھی بہت بنیادی سطح پر ہے، یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر کے سائنس دانوں نے جی ایم اوز کو کھلے عام کھیتی باڑی کے عمل میں استعمال کرنے پر سخت تشویش کا اظہار کیا ہے۔ خطرہ یہ ہے کہ جینیاتی تبدیلی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی زندگی (جی ایم اوز) اور عام جانداروں کے درمیان افزائش نسل کے عمل کے نتیجے میں جو نئی پود پیدا ہوگی، اس میں کچھ ایسی تبدیلی نہ ہو، جو عام جانداروں پر حاوی ہو کر نظام قدرت میں تباہی یا بگاڑ کا باعث بنے۔

پیچھے دی گئی جینیاتی کپاس کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ اسی طرح سے جینیاتی مچھلیاں بھی بنائی گئی ہیں۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ جی ایم مچھلی عام مچھلی سے زیادہ خوراک کھاتی ہے اور اس سے باقی مچھلیوں کی غذا میں کمی آجاتی ہے۔ اس بات سے یہ خدشہ پیدا ہوا ہے کہ یہ جینیاتی آرگینزمز (اجسام) قدرت پر حاوی ہو جائیں گے اور نظام میں قائم توازن کو درہم برہم کر دیں گے۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس ٹیکنالوجی کے بارے میں سائنسی دنیا کے اندر اس قدر اختلافات ہیں تو یہ متنازعہ ٹیکنالوجی ہم پر اس قدر تیزی سے کیوں مسلط کی جارہی ہے؟

اس کا جواب بہت سادہ ہے۔ یہ ٹیکنالوجی سرمایہ بڑھانے کا ایک اعلیٰ ذریعہ سمجھی جاتی ہے۔ تحقیق کرنے اور نئی اشیاء منڈی تک لانے کا عمل اب پہلی دنیا کی بڑی بڑی کمپنیوں کے ہاتھوں میں ہے، مثلاً زرعی سرمایہ دارانہ کمپنیوں میں سنجینٹا، مونسانٹو، ایونٹس، آئی سی آئی بڑے بڑے نام ہیں، جو کہ جینیاتی انجینئرنگ کو بڑے پیمانے پر فروغ دے رہے ہیں۔

ان کمپنیوں نے دنیا کی جینیاتی مواد کو اپنی ملکیت کہنا شروع کر دیا ہے۔ انہوں نے ڈبلیو ٹی او کے تحت ذہنی ملکیت کے معاہدے (ٹرپس) کو دنیا پر مسلط کیا اور اب ہر ملک میں اس عالمی قانون کو زبردستی نافذ کروا رہے ہیں۔ ملکوں کے قوانین میں تبدیلی کروا لینے کے بعد یہ کمپنیاں وہاں جینیاتی آرگینزمز کی درآمد اور پیداوار شروع کروا دیتی ہیں۔ اس ٹیکنالوجی سے کمپنیوں کو کروڑوں روپے کا فائدہ پہنچ رہا ہے اور ان کمپنیوں کو سوائے اپنے منافع کے، کسی جانی و مالی نقصان کی کوئی پرواہ نہیں۔ پہلی دنیا کے ترقی یافتہ ممالک جن میں امریکہ، کینیڈا، جاپان، جرمنی، فرانس، اٹلی اور انگلستان شامل ہیں، اپنی ملٹی نیشنل کمپنیوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ ظاہر ہے جتنا سرمایہ یہ کمپنیاں کمائیں گی اتنا ہی مالی فائدہ اپنے ملکوں کو پہنچائیں گی۔

جینیاتی آرگینزمز کے خطرے سے تحفظ کے لیے کئی ممالک نے سالوں کی بحث و مباحثہ کے بعد حیاتیاتی تحفظ کا معاہدہ جنوری ۲۰۰۰ء میں مکمل کیا تھا۔ اس معاہدے کی بنیاد جینیاتی آرگینزمز کی تجارت کے لیے اصول و ضوابط مقرر کرنا ہے۔ اس معاہدے میں ہر ملک کو اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ اگر وہ اپنے ہاں کسی مخصوص جی ایم اشیاء کو بغیر سائنسی بنیاد پر بھی آنے سے روکنا چاہتے ہیں تو ان کو اس بات کی اجازت ہے۔[۷] یہ پروٹوکول تحریری شکل میں موجود ہے۔ اس میں قدرتی ماحول اور انسانیت کے تحفظ کے لیے بڑے مثبت قدم اٹھائے گئے ہیں، لیکن اس سے بڑا مسئلہ ہر ملک میں بننے والے قوانین میں ان اقدامات کو برقرار رکھنا ہے۔

پاکستانی حکومت نے ابھی تک یو پی او وی کنونشن کے تحت پلانٹ بریڈرز ایکٹ (بیج پر کاشتکار کا انفرادی حق ملکیت) نافذ نہیں کیا ہے۔ اس ایکٹ کے تحت نئے اقسام کے بیج کا حق ملکیت ملٹی نیشنل کمپنیوں کو حاصل ہو جائے گا۔ جب اس ایکٹ کو شروع میں تحریر کیا گیا تو ایک شق ایسی لکھی گئی جس میں جی ایم اوز سے ہونے والے نقصانات کا معاوضہ مالک کمپنیوں سے مانگنے کا حق محفوظ رکھا گیا۔ لیکن مونسانٹو جو کہ جینیاتی بیج اور دیگر زرعی اشیاء بنانے والی ایک بہت بڑی امریکی کمپنی ہے اس نے پاکستان کے محکمہ تصدیق و اندراج برائے بیج (Seed Certification & Registration Department) کو یہ احکامات صادر کیے کہ اس شق کو پلانٹ بریڈرز ایکٹ سے نکال دیا جائے ان کو یہ خوف ہے کہ ''اگر یہ شق شامل رہی تو ہم پر کوئی بھی کیس کر سکتا ہے''۔ ان کا مزید کہنا ہے کہ جینیاتی بیج اور عام بیج میں کوئی تفریق نہ کی جائے۔[۸]

اس وقت حکومت کے زیر غور آخری مسودہ ہے، اس میں سے اس شق کو ہٹا دیا گیا ہے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہوا کہ جی ایم اوز فصل کے کسی بھی نقصان کی ذمہ داری کمپنی پر عائد نہیں کی جا سکے گی بلکہ نقصان کسان کو ہوگا۔ کارپوریٹ فارمنگ ہمارے ملک میں داخل ہو چکی ہے۔ پچھلے دنوں اخبارات میں یہ خبر آئی تھی کہ ملک میں ساڑھے سات لاکھ ایکڑ زمین کارپوریٹ فارمنگ کے لیے دی جائے گی۔ جیسے ہی پلانٹس بریڈرز رائس ایکٹ (بیج پر انفرادی حق ملکیت) کا نفاذ ہو جاتا ہے تو پھر ہماری زراعت جینیاتی بیج کے خطرے کی زد میں آجائے گی۔ سبز انقلاب کی تباہ کاریوں کے بعد یہ زہر سے رچا بسا دوسرا کھیل ہے جو تحفظ خوراک کے نام پر ہماری زمین پر کھیلا جا رہا ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ بایوسیفٹی پروٹوکول کے تحت حکومتیں اپنے ملک میں جینیاتی آرگینزمز کی تجارت پر مکمل پابندی لگا سکتی ہیں۔ ہم سب کا فرض بنتا ہے کہ حکومت پر دباؤ ڈال کر جینیاتی آرگینزمز کو ملک میں آنے سے روک دیں۔

حوالہ جات

۱۔ باسمتی بایو پائریسی، ریسرچ فاؤنڈیشن فار سائنس، ٹیکنالوجی اینڈ ایکالوجی۔
۲۔ ایم ایس سوامی ناتھن، ایگرو بائیوڈائیورسٹی اینڈ فارمرز رائٹس، کونارک پبلیشرز، ۱۹۹۶ء۔
۳۔ مارٹن بروکس، گیٹ اے گریپ اون جینیٹیکس، ٹائم لائف بک، ۱۹۹۸ء۔
۴۔ رابرٹ علی بریک، بریو نیو سیڈز، صفحہ ۴۳۔
۵۔ تھرڈ ورلڈ نیٹ ورک، دی نیڈ فار گریٹر ریگولیشن اینڈ کنٹرول آف جینیٹک انجینئرنگ، ۱۹۹۵ء۔
۶۔ جیز یسلر اور مارگریٹ میلین، پیرلز امیڈسٹ دی پرومیس، یونین آف کنسرنڈ سائنٹسٹ، ۱۹۹۳ء۔
۷۔ رابرٹ علی بریک ایضاً صفحہ ۵۰۔
۸۔ مدثر رضوی، کارپوریٹ فارمنگ کمز ٹو پاکستان۔

کارپوریٹ فارمنگ اسباب واثرات*

عذرا طلعت سعید

کارپوریٹ فارمنگ نئی آزاد معیشت (آزاد تجارت) میں ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ پاکستان میں آجکل حکومت کا اس طریقہ کاشتکاری پر بہت زور ہے اور اسے فروغ دینے کے لیے نت نئے منصوبے، مراعات اور سہولیات اخبارات میں شائع ہو رہے ہیں اور امکان ہے کہ عنقریب کارپوریٹ فارمنگ پاکستان میں رائج کر دی جائے گی۔ کاشت کاری صرف ایک پیداوار کا ذریعہ نہیں بلکہ انسان کی سب سے بنیادی ضرورت یعنی خوراک کی فراہمی کا واحد وسیلہ بھی ہے۔ اس لیے اس شعبے میں آنے والی تمام تبدیلیاں عوام کے سمجھنے کے لیے بہت ضروری ہیں اس کے علاوہ ہم کو یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارے ملک کے ۴۰ فیصد سے زائد لوگوں کا روزگار اس شعبے سے منسلک ہے، اس لیے اس شعبہ کے لیے جو بھی منصوبے بنائے جائیں اس میں قوم کی خوشحالی اور بہبودی کا عنصر کارفرما ہونا ضروری ہے۔ اس وقت دنیا بھر میں آزاد معیشت اور تجارت کے خلاف احتجاج ہو رہا ہے۔ یہ احتجاج نا صرف ترقی پذیر ممالک کی عوام کر رہی ہے بلکہ بعض حکومتیں بھی اس میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ترقی یافتہ ممالک کے عوام آزاد تجارت کے صنعتی اثرات دیکھتے ہوئے اس کی شدید مخالفت کر رہے ہیں اس احتجاج کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ جب سے زراعت کے شعبہ کو آزاد تجارت میں شامل کیا گیا ہے، دنیا بھر میں عام آدمی کے لیے خوراک کا حصول مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔

کارپوریٹ فارمنگ یا انڈسٹریل فارمنگ کیا ہے؟

- کارپوریٹ فارمنگ میں کاشت ہزاروں ایکڑ پر کی جاتی ہے۔
- اس زمین کی مالک بڑی بڑی تجارتی کمپنیاں ہوتی ہیں۔ زمین مستقل خرید لی جاتی ہے یا مالکان سے لمبے عرصے کے لیے ٹھیکہ پر لی جاتی ہے۔
- کارپوریٹ فارمنگ میں جدید ترین ٹیکنالوجی کا استعمال ہوتا ہے جس میں ہر طرح کی مشینیں، کیمیکلز اور نئے جینیاتی بیج وغیرہ شامل ہیں۔
- ان زمینوں پر ہاری یا کسان کی گنجائش نہیں ہوتی بلکہ کمپنیوں کے ملازم اور مزدور کام کرتے ہیں اور کاشتکاری کارپوریشن کی پالیسی اور مرضی کے مطابق ہوتی ہے۔

کارپوریٹ فارمنگ سے وابستہ امیدیں

کارپوریٹ فارمنگ سے حکومت خاصی امیدیں لگائے بیٹھی ہے۔ حکومت کا خیال یہ ہے کہ جدید ترین کاشت کاری اپنانا بہت ضروری ہے، جس سے ایک طرف تو زرعی پیداوار کو بڑھایا جا سکتا ہے تو دوسرا غیر کاشت شدہ زمین کو بھی زیر کاشت لایا جا سکتا ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ جدید مشینوں کے استعمال سے زمین کی پیداواری کارکردگی بڑھ جاتی ہے یعنی کم وقت اور کم خرچ میں جدید زرعی اصلاحات کے ذریعے زیادہ پیداوار حاصل کی جا سکتی ہے۔

ڈبلیو ٹی او کے عالمی زرعی معاہدے کی رو سے دنیا بھر میں حکومتیں اپنے زراعت کے شعبے کو طاقتور اور خود کفیل بنانے کے لیے جتنی بھی سہولیات اور مراعات دیتے ہیں وہ ختم کر دیں اور اپنی زرعی منڈی کو بغیر کسی تفریق کے سب کے لیے کھول دیں۔ اس معاہدے کے بعد دنیا کی چند بڑی زرعی کمپنیاں پوری دنیا کی زراعت پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے کے لیے حرکت میں آ گئیں ہیں۔

عام طور پر یہ کمپنیاں خود کو انسان دوستی کا نمونہ بنا کر پیش کرتی ہیں، جیسے پورے عالم انسانی کی خوراک کی ضروریات کا صرف ان ہی کو خیال ہے جس کے لیے وہ ہر وقت زراعت میں نئی ایجادات کرتے رہتے ہیں! ہمارے سمجھنے کے لیے یہ بات ضروری ہے کہ کارپوریشن، جن کی بنیاد ہی منافع کا حصول ہے، زراعت میں جدید اصلاحات پر زور دینے سے ان کا مقصد دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے خوراک میں خود کفالت حاصل کرنا نہیں، بلکہ منافع کمانے کے لیے نت نئے ذرائع تلاش کرنا ہے۔

ان کمپنیوں کا تعلق ترقی یافتہ صنعتی ملکوں سے ہے اور ان کو اپنے ملکوں کے حکمران طبقے کی مکمل مدد حاصل ہے اور اس کے برعکس ہمارے جیسے ملکوں کے حکمران طبقے کا مفاد عوام کی فلاح و بہبود نہیں بلکہ ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ ملکوں کے حکمران طبقے کی اطاعت ہے۔ اس لیے ان کمپنیوں کو ہمارے غریب عوام کا استحصال کرنے، سخت زہریلی آلودگی پھیلا کر ماحول تباہ کرنے، خوراک جیسی بنیادی انسانی ضرورت کی چیز پر اپنی اجارہ داری قائم کر کے منافع کمانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

پاکستان میں کارپوریٹ فارمنگ

وفاقی وزیر خوراک و زراعت و حیوانات جناب خیر محمد جونیجو صاحب کے حالیہ بیان کے مطابق کارپوریٹ فارمنگ کو انڈسٹری کا درجہ دیا جائے گا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کو وہ سب سہولتیں میسر ہوں گی جو کہ انڈسٹریل سیکٹر کو فراہم کی جاتی ہیں، جن میں قرضہ جات کی سہولت بھی شامل ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کارپوریشنوں کو کاشت کے لیے زمین خرید کر اپنے نام ٹرانسفر کرانے پر کوئی ٹیکس نہیں دینا پڑے گا۔ یہ کمپنیاں حکومتی زمین کو ۵۰ سال تک کے لیے لیز پر لے سکتی ہیں یا خرید سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ ۴۹ سال کے لیے مزید اس زمین کو حاصل کر سکتی ہیں۔

حکومت نے ان کے لیے زمین کو لیز پر لینے یا خریدنے کی کوئی حد مقرر نہیں کی۔ یعنی وہ جتنی چاہیں زمین حاصل کر سکتی ہیں۔ وفاقی وزیر جناب جونیجو صاحب نے حکومت سے درخواست کی ہے کہ سرمایہ دارانہ کمپنیوں کو خود مختاری ہونی چاہیے کہ وہ اپنی

* چیلنج، اگست ۲۰۰۱ء، صفحہ ۹ تا ۱۰۔

مرضی سے اپنے لیے زمین کی حد مقرر کریں۔ اس حوالے سے حکومت ان کو قانونی تحفظ فراہم کرے گی، تاکہ مستقبل میں ان کمپنیوں کو کوئی مسائل درپیش نہ ہوں۔

وہ سرمایہ دارانہ کمپنیاں جو آب پاشی والے علاقے میں کارپوریٹ فارمنگ نافذ کریں گے، ان کے لیے ۵ سال ٹیکس کی چھوٹ ہے اور بارانی علاقوں کے لیے ۷ سال ٹیکس کی چھوٹ ہے۔ کمال کی بات یہ ہے کہ یہ چھوٹ صرف ان کمپنیوں کے لیے ہے جن کے نام اسٹاک ایکسچینج میں رجسٹرڈ ہیں۔ یعنی کہ مضبوط ترین سرمایہ دارانہ کمپنیوں کو مکمل کنٹرول دینے کا اعلیٰ پروگرام نافذ کیا جارہا ہے۔ اوپر بیان کردہ تفصیلات سے صاف واضح ہے کہ کارپوریٹ فارمنگ رائج کرنے سے صرف ڈبلیوٹی او کے زراعتی معاہدے کو عملی جامہ پہنایا جارہا ہے۔

حکومت کا خیال ہے کہ کارپوریٹ فارمنگ سے ملک میں پیداوار میں اضافہ ہوگا اور ساتھ ساتھ منافع بھی حاصل ہوگا، لیکن ان سب خیالات پر عمل کرنے سے پہلے یہ بہتر ہے کہ ہماری حکومت آس پاس کے ممالک پر نظر ڈالے جن کے ہاں کافی عرصے سے کارپوریٹ فارمنگ ہورہی ہے۔ تحقیق بتاتی ہے کہ بڑی بڑی کمپنیاں جب کاشت کراتی ہیں تو زہریلی دوا اور کیمیائی کھاد کا بہت زیادہ استعمال کرتیں ہیں۔ ہر خطے سے رپورٹ آرہی ہے کہ فصلوں پر کیڑوں کے سخت ترین حملے ہورہے ہیں۔ زمین کی زرخیزی کم ہوکر بالکل بانجھ ہونے کی نہج پر پہنچ چکی ہے۔ سائنسی تحقیق واضح کرتی ہے کہ ان کیمیائی اشیاء کی وجہ سے انسانوں اور دوسرے جانداروں کی صحت پر بہت مضر اثرات مرتب ہورہے ہیں۔ مردوں اور عورتوں میں ان کے کیمیائی اثرات سے بانجھ پن میں اضافہ ہورہا ہے، عورتوں میں بچے ضائع ہونے اور معذور بچے پیدا ہونے کی شرح بڑھتی جارہی ہے۔ جلد اور کینسر کی بیماریاں عام ہونا شروع ہوگئیں ہیں۔ ماحولیات میں زہر پھیلنے کی یہ حد ہے کہ آئس لینڈ جیسے ملک جہاں پر کاشت کاری نہیں ہوتی وہاں پر بھی کیمیائی دواؤں کے پانی میں آثار نظر آتے ہیں۔ یہاں پر جینیٹک انجینئرنگ پر تفصیل سے لکھنے کے لیے جگہ کم ہے ورنہ اس پر خطرناک رپورٹ آرہی ہیں۔

انسانی زندگی اور ماحول کو اتنا نقصان پہچانے کے بعد بھی یہ کمپنیاں اپنے منصوبوں پر کیوں بضد ہیں؟ اور کیوں اپنے برے ارادوں سے باز نہیں آتیں؟ آج ہمارے سائنس داں، دانشور اور حکومت سب کے لیے ایک لمحہ فکریہ ہے کہ کیا ہم پھر اپنی آنے والی نسلوں اور سرزمین کی بھلائی کو مدنظر رکھے بغیر پھر سے ایسے نئے طریقہ کار کو اپنا لیں گے جس نے ہمیں سوائے تباہی کے اور کچھ نہیں دیا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم باقی دنیا کے عوام کے ساتھ مل کر اس سرمایہ دارانہ تباہ کاری کے خاتمہ کے لیے جدوجہد میں شامل ہوجائیں۔

ایگری بزنس یا زراعتی سرمایہ دارانہ کمپنیاں

بظاہر تو زرعی کمپنیوں کا ہماری عام زندگی سے کوئی خاص تعلق نظر نہیں آتا مگر غور کیا جائے تو یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ ہماری روز مرہ زندگی میں ان کا بہت عمل دخل ہے۔ مثال کے طور پر اگر نیسلے کو ہی لے لیجئے، جو کہ سوئزرلینڈ کی بہت بڑی زرعی کمپنی ہے۔ یہ بہت سادی روز مرہ کی چیزوں کے علاوہ دودھ بھی فراہم کرتی ہے اور پوری دنیا میں اسکے لیے مشہور ہے۔ نیسلے، دودھ خاص طور پر چھوٹے بچوں کے لیے بناتا ہے، جس کی وہ میڈیا پر ایسی پبلسٹی کرتا ہے کہ جیسے یہ دودھ بچوں کے لیے بہت ہی ضروری ہے اور ماں کی محبت کا ثبوت بھی ہے کہ وہ اپنے بچے کو نیسلے کا دودھ پلاتی ہے۔ تحقیق یہ بات ثابت کرتی ہے کہ خشک دودھ چھوٹے بچوں کے لیے نقصاندہ ہے۔ آجکل نیسلے نے گائے ، بھینس کے دودھ کو ڈبوں میں، جسے ملک پیک کہا جاتا ہے گھر کے سارے افراد کے استعمال کے لیے مارکیٹ میں فراہم کیا ہے۔ اس دودھ میں ایسے کیمیائی اجزاء شامل کیے جاتے ہیں جس سے یہ دودھ زیادہ دنوں تک چل سکے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا یہ دودھ تازہ اور قدرتی دودھ کا نعم البدل ہوسکتا ہے؟ اور کیا یہ ہمارے لیے اور خاص طور پر ہمارے بچوں کے لیے صحت مند ہے؟

آجکل زرعی کمپنیاں بیجوں پر نت نئے تجربات کرکے قدرتی توازن سے کھیلنے کی کوششش کررہی ہیں۔ کسان مرد اور عورت نے قدرت کے ماحول کے مطابق اور اپنے ذہن کے استعمال سے اعلیٰ سے اعلیٰ بیج پیش کیا۔ جسے وہ صدیوں سے کل انسانیت کی ملکیت تصور کیا کرتے تھے، جو اب ان کمپنیوں کے آنے کی وجہ سے اور ڈبلیو ٹی او کی ذہنی ملکیت کے معاہدے (TRIPS) کی رو سے ان کمپنیوں کی ملکیت بن چکا ہے۔ اب کسان ان کمپنیوں کو ان کی نام نہاد ایجاد کا معاوضہ دیکر ہی حاصل کرسکتا ہے۔ ہمارے ملک میں مونسانٹو ایک بہت بڑی امریکی کمپنی ہے، جو ہمیں بہت سی سبزیوں کے بیج بیچتی ہے۔ کچھ عرصہ قبل اس نے کارگل، جو کہ ایک اور بہت بڑی زرعی کمپنی ہے، اسکا بیج بنانے کا یونٹ خرید لیا ہے۔ اس طرح سے اسکا مارکیٹ پر کنٹرول بہت بڑھ گیا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ بیج جیسی نہایت اہم شے، جو پہلے کسی پیسے یا ذہنی ملکیت کا معاوضہ کے بغیر حاصل ہوتی تھی اب اس بیج کے لیے ہمیں مونسانٹو جیسی کمپنیوں پر انحصار کرنا پڑے گا۔

ہمارے لیے بہت ضروری ہے کہ ان کمپنیوں پر اپنی خوراک کا انحصار کرنے سے پہلے ان کے بارے میں کچھ سمجھ لیں۔ مونسانٹو، ایجنٹ اورنج (نارنجی) بنانے والی کمپنی ہے جس نے انسانی صحت پر بہت برے اثرات چھوڑے جس کی وجہ آنے والی نسلوں میں پیدائشی معذوری منتقل ہوئی۔ یہ اب دنیا کی سب سے بڑی کیمیکل بنانے والی کمپنی مانی جاتی ہے۔ فصل میں گھاس پھوس ختم کرنے کے لیے یہ کمپنی ایک زہریلی دوا (راؤنڈاپ) بناتی ہے جس کی وجہ سے قدرتی طور پر پیدا ہونے والی مختلف جڑی بوٹیاں جو انسان کے لیے بہت مفید ہوتی ہیں، پنپ نہیں پاتیں جس سے قدرتی توازن بگڑنے کے خطرات بڑھتے جارہے ہیں۔

خشک سالی اور ریاستی و عالمی اداروں کی پالیسیاں*

سرتاج خان

اس سال مون سون (برسات) کے موسم میں پچھلے چند سالوں کے مقابلے میں زیادہ بارش ہوئی اور تمام دریاؤں میں پانی ۵ سال بعد پہلی مرتبہ خریف کے موسم میں اپنے معمول کی سطح تک پہنچا۔[1] پاکستانی عوام کو گزشتہ تین سال کے دوران خشک سالی کا سامنا کرنا پڑا۔ ملک کے دیگر حصوں کے علاوہ سندھ میں تھرپارکر، میرپور خاص، سانگھڑ، دادو اور ٹھٹھہ کے اضلاع اور بلوچستان میں چاغی، خاران، پشین، قلعہ سیف اللہ اور قلعہ عبداللہ کے اضلاع خشک سالی سے شدید متاثر ہوئے۔ ضلع تھرپارکر کی ۴۰ فیصد آبادی کو نقل مکانی کرنی پڑی۔ حکومت سندھ کی ایک رپورٹ کے مطابق متاثرہ اضلاع میں تین ہزار دیہات کے تقریباً ۱۴ لاکھ افراد اور ۵۶ لاکھ مویشی متاثر ہوئے۔ متاثرین میں سے ۹۵ فیصد پہلے ہی غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارتے تھے۔[2] سندھ اور بلوچستان میں خشک سالی سے مجموعی طور پر ۲۲ لاکھ افراد اور ۷۲ لاکھ مویشی متاثر ہوئے۔[3]

گزشتہ تین سال کے دوران جو علاقے شدید خشک سالی کی زد میں تھے انہی علاقوں میں اس سال بارشوں اور سیلاب سے زیادہ تباہی ہوئی۔ ضلع بدین میں ۲ لاکھ ۲۵ ہزار ایکڑ رقبے پر کھڑی فصلوں کو پہنچنے والے نقصان کا تخمینہ ۲۶۲ء۲ بلین روپے لگایا گیا ہے۔ جہاں کپاس کی ۸۵ فیصد، گنے کی ۶۵ فیصد، دھان کی ۶۳ فیصد، مرچ اور سبزیوں کی ۹۵ فیصد کے علاوہ پیاز اور ٹماٹر کی فصل مکمل طور پر تباہ ہوئی۔ ۱۹۹۹ء میں یہاں سمندری طوفان آیا پھر خشک سالی کے بعد اب بارش اور سیلاب۔ ٹھٹھہ میں خریف کی تمام اہم فصلیں بشمول دھان، گنا، کپاس اور پان کی فصلوں کا ۸۵ فیصد کے علاوہ ۹۰ فیصد سبزیاں بھی تباہی سے دوچار ہوئیں۔ مچھلیوں کے تالاب تو مکمل طور پر نیست و نابود ہو گئے ہیں۔ دریائے سندھ کے کنارے واقع سکھر اور گھوٹکی کے ۲۰۰ گاؤں زیر آب آ گئے۔ تھرپارکر میں مسلسل بارش سے ۶۲۰ گاؤں میں ۲,۴۵۰ پکے اور ۵,۷۵۰ کچے مکانات مکمل تباہ ہوئے جبکہ ہزاروں مکانات کو جزوی نقصان پہنچا۔[4] ۸ ہزار سے زائد پالتو جانور ہلاک ہونے کے علاوہ کپاس، گنا اور مرچ کی فصل کا بالترتیب ۷۵ فیصد، ۵۰ فیصد اور ۸۵ فیصد حصہ تباہی سے دوچار ہوا جبکہ دیگر فصلوں کا بھی ۷۵ فیصد حصہ تباہ ہوا۔[5] ایک ہفتہ کی مسلسل بارش کے بعد حکومت سندھ نے ۲۷، جولائی کو سندھ میں ہنگامی حالات کا اعلان کیا۔ حکومت سندھ کے ریلیف (امدادی) کمیشن کے مطابق بارش سے ۳,۴۲۲ گاؤں سے ملحقہ ۳۴ لاکھ ایکڑ سے زائد رقبے پر کھڑی فصلیں تباہ ہوئیں۔ بارش سے مجموعی طور پر ۸ لاکھ سے زیادہ افراد متاثر ہوئے جس میں سے ۱۱۶۸ افراد ہلاک اور ۲۴۹ زخمی ہوئے۔ بارش سے مجموعی طور پر ۱۴ لاکھ سے زائد مکانات کو نقصان پہنچا اور ۹ ہزار سے زائد مویشی ہلاک ہوئے۔[6] لیکن آزاد ذرائع اور اخباری اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ نقصانات اور تباہی کا سرکاری جائزہ حقائق سے میل نہیں کھاتا اور نقصانات کم ظاہر کر کے ریاستی اداروں کی غفلت اور حکومت کی نااہلی کو چھپانے کی کوشش کی گئی ہے۔ سندھ آباد گار بورڈ نے کہا کہ بارشوں سے سندھ کو ۱۵ بلین روپے کا نقصان پہنچا ہے۔ بورڈ کا کہنا ہے کہ ۲۰۰۳ء-۲۰۰۲ء تک سندھ کے زرعی شعبے کو ۴۲ بلین روپے کا نقصان برداشت کرنا پڑا ہے۔[7]

بارش سے متاثرہ اضلاع مثلاً نواب شاہ، کوٹری اور دادو سے آنے والی خبروں کے مطابق آنتوں کی سوزش، ملیریا اور تیز بخار کی بیماریاں عام ہو گئیں۔ بدین کے ۳۵ ہزار افراد میں سے ۲۰ فیصد آنتوں کی سوزش کے شکار تھے۔[8]

بلوچستان میں سیلاب سے ۱۴ اضلاع میں ۳۶ سے زیادہ افراد ہلاک ہوئے۔ نصیر آباد، جعفر آباد، لسبیلہ، خضدار، جھل مگسی، سبی، ہارنئی اور زیارت کے اضلاع میں سیلابی ریلوں سے ۴ لاکھ ایکڑ رقبہ پر کھڑی فصلوں کو نقصان پہنچا۔[9] پنجاب میں سیالکوٹ اور نارووال کے علاقے بارش اور سیلاب سے متاثر ہوئے۔ شکرگڑھ اور نارووال میں ۷۵ گاؤں ڈوب گئے۔ صوبہ سرحد میں ضلع مردان کے دیہی علاقوں میں مکئی، گنا اور ناشپاتی کے باغات بری طرح متاثر ہوئے۔ بارش سے بڑے شہروں کراچی، لاہور، پنڈی، پشاور اور حیدر آباد کی شہری اور دیہی آبادی بھی شدید متاثر ہوئی۔

ریاستی اور بین الاقوامی اداروں کی امداد کے دعوؤں کی قلعی متاثرہ علاقوں سے موصول ہونے والی رپورٹوں سے کھل جاتی ہے۔ ٹھٹھہ میں امداد کے حکومتی پروپیگنڈے کے خلاف متاثرین نے احتجاجی مظاہرہ کیا۔ امداد اور بحالی کے حکومتی دعوؤں اور طریقہ کار سے لے کر جائزہ تک کسی بھی عمل پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ حکومت نے خشک سالی کا جائزہ لینے کے لیے وزیر خزانہ کے ایک مشیر کو مقرر کیا تھا جنہوں نے اسلام آباد میں اپنے آفس سے قدم باہر نکالے بغیر خشک سالی پر رپورٹ مرتب کی اور نقصان کا تخمینہ ۶۰ بلین (۶۰ ارب) روپے لگایا لیکن امداد کا اعلان صرف ۱۰ بلین روپے کا ہوا اور وہ بھی تقسیم نہ کیا جا سکا۔ حالانکہ کسانوں کو امداد کی اشد ضرورت تھی۔[10]

قدرتی آفات کے ساتھ ساتھ حکومتی اور عالمی پالیسیوں نے بھی موجودہ صورت حال میں مزید بگاڑ پیدا کیا ہے۔ فوجی حکومت نے ۱۹۹۹ء میں کسانوں کو صرف کپاس کے ضمن میں ۵۰ ملین (۵ کروڑ) روپے اور اس سے اگلے سال گندم کی خریداری کے ضمن میں ۲۰ ملین روپے کا نقصان پہنچایا۔[11] ڈیزل کی قیمت ۱۹۹۹ء میں ۱۲ روپے فی لیٹر تھی جو ۲۰۰۳ میں بڑھ کر ۲۲ روپے، یوریا کھاد کی قیمت ۲۶۰ روپے فی بوری سے ۴۲۰ روپے اور پوٹاش کی قیمت ۴۵۰ سے بڑھ کر ۶۵۰ روپے ہوئی۔ کسانوں کے استعمال میں آنے والی تقریباً ہر شے پر ۱۵ فیصد کے حساب سے جنرل سیلز ٹیکس (جی ایس ٹی) نافذ کیا گیا ہے۔[12] حکومت تیل اور گیس پر عائد کردہ ٹیکسوں میں مسلسل اضافہ کر رہی ہے مثلاً ۲۰۰۰ء میں یہ رقم ۳۲ بلین روپے، ۲۰۰۲ء-۲۰۰۱ء میں ۳۹ بلین روپے اور اس سال ۴۵٫۵ بلین روپے کر دی گئی اسی طرح گیس پر ۱۵ بلین روپے ٹیکس عائد کر دیا گیا ہے۔[13]

* چیلنج، جولائی تا دسمبر ۲۰۰۲ء، صفحہ ۱۲ تا ۱۴۔

دنیا کے بیشتر ترقی پزیر ممالک کی طرح پاکستان میں بھی زراعت، صنعت اور ترقی سے متعلق پالیسیاں عالمی مالیاتی اداروں کے ساتھ کیے گئے معاہدوں کے پس منظر میں بنائی جاتی ہیں جو کہ عوام اور ماحول پر پڑنے والے اثرات کو یکسر نظر انداز کر دیتی ہیں۔ کیونکہ پالیسیاں مرتب کرنے والوں کے پیش نظر ایک مخصوص مراعات یافتہ طبقے کا مفاد ہوتا ہے۔ اس ضمن میں دیر کے جنگلات اور ڈیموں کی تعمیر سے متعلق پالیسیوں کی مثال دی جاسکتی ہے جس میں فوائد تو بیان کیے جاتے ہیں مگر ان سے پہنچنے والے نقصانات کو نہ صرف نظر انداز کیا جاتا ہے بلکہ منظر عام پر لایا ہی نہیں جاتا۔ کسی خطے میں واقع ہونے والی ماحولیاتی تبدیلیوں کو وہاں کی معاشی و سماجی تبدیلیوں سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ اگر معاشی و سماجی عوامل، قدرتی عوامل کے لیے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوں تو دونوں مل کر قدرتی عوامل و آفات کو مزید بگاڑنے کا سبب بنتے ہیں۔ پاکستان کے دیگر ترقیاتی منصوبوں کی طرح زرعی آبپاشی اور پانی کے موجودہ نظام کو ترتیب دینے میں بھی ریاستی اور عالمی اداروں کا عمل دخل ہے۔ اس کی ایک مثال لیفٹ بینک آؤٹ فال ڈرین (ایل بی او ڈی) کا منصوبہ ہے جس کا مقصد نواب شاہ، سانگھڑ اور میر پور خاص سے نمکین پانی کی نکاسی اور اس پانی کا سمندر میں اخراج ہے۔ اس منصوبہ کا آغاز ۱۹۸۶ء میں عالمی بینک اور ایشیائی ترقیاتی بینک سمیت دیگر اداروں کے تعاون سے کیا گیا۔[۱۴] اس کی وجہ سے بدین اور ٹھٹھہ کے عوام کو متواتر نقصان پہنچ رہا ہے۔ جب بھی سمندر میں لہریں بلند ہوتی ہیں یا بارش ہوتی ہے، نہر کا پانی بدین اور ٹھٹھہ کے علاقوں میں پھیل جاتا ہے کیونکہ پانی کو سمندر میں جانے کا راستہ نہیں ملتا، اس سال بارشوں میں یہی ہوا۔ بدین میں آنے والے سیلاب کی اہم وجہ قدرتی نہیں بلکہ انسانی عمل دخل کا نتیجہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ریاستی پالیسیوں سے حیاتی تنوع، ماحول، ساحلی تحفظ، خوراک اور روزی کے ذرائع متاثر ہوئے ہیں۔ اس لیے ریاستی پالیسیوں کو درست نہیں کہا جاسکتا۔

معاشی ''ترقی'' حاصل کرنے کے لیے نجکاری کے اصولوں پر پابند ہو کر صنعتی پیداوار پر زیادہ انحصار کا نتیجہ ماحولیاتی تنزلی اور آلودگی کی صورت میں نکلا ہے۔ اس کی مثال کیڑے مار ادویات اور کیمیائی کھاد جیسی مہلک اشیاء پیداوار کا زیادہ سے زیادہ استعمال ہے۔ پاکستان میں خاص کر کے زراعت کے شعبے میں ''ترقی کے تجزیہ'' سے واضح ہوتا ہے کہ یہ پائیدار ترقی کے لیے متعین کردہ معیار سے کسی طرح بھی میل نہیں کھاتا۔ عالمی بینک سے تعلق رکھنے والے ایک معیشت داں کے مطابق پاکستان ہر سال ماحولیاتی تنزلی کے باعث مجموعی ملکی پیداوار (جی ڈی پی) کا ۴ فیصد ضائع کرتا ہے۔[۱۵]

اگرچہ ریاستی ادارے اور ذرائع ابلاغ خشک سالی اور سیلاب سے ہونے والی تباہ کاریوں کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ گویا یہ قدرتی ہیں اور ان کا تدارک ممکن نہیں، لیکن سائنسی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ ان دعوؤں میں زیادہ سچائی نہیں ہے۔ پانی کے موضوع پر حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب میں کہا گیا ہے کہ ''پانی کی کمی صرف قدرتی قلت کا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ سماجی طور پر پیدا کردہ قلت بھی ہے جو... معاشی بگاڑ کا نتیجہ ہے۔''[۱۶]

ماہرین پاکستان، بھارت، ایران اور افغانستان کے خطوں میں واقع ہونے والی موسمیاتی تبدیلیوں کو مقامی اور عالمی سطح پر رونما ہونے والی تبدیلیوں سے جوڑتے ہیں۔[۱۷] ان تبدیلیوں کی ایک اہم وجہ ہمالیہ کی پہاڑوں پر تیزی سے غائب ہوتے ہوئے جنگلات ہیں جن کی وجہ سے بادل بننے اور بارش ہونے کے نظام میں مدد ملتی ہے۔ جنگلات میں شدید کمی کی وجہ سے مون سون میں بگاڑ پیدا ہو گیا ہے۔ اس طرح خشک سالی اور اس کے بعد اچانک تیز بارشیں اور سیلاب کا ایک گردشی چکر بنتا دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً گزشتہ ۳۰ سالوں میں جس قدر سیلاب دریائے سندھ کے میدانی علاقوں میں آئے وہ اس سے ۷۰ سال قبل آنے والے سیلابوں کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔[۱۸] ان موسمی تبدیلیوں کی وجہ سے صحرائی علاقے تیزی سے بڑھتے جارہے ہیں اور زمین بنجر ہورہی ہے۔

پاکستان میں جنگلات ۴٫۵۷ ملین ہیکٹر رقبہ پر مشتمل ہیں جو کل رقبہ کا صرف ۵٫۲ فیصد ہے۔ یہ عالمی معیار (۲۵ فیصد تا ۳۰ فیصد) سے بہت کم ہے۔ ان جنگلات میں بھی کاروباری ترجیحات کی وجہ سے ۳٫۱ فیصد سالانہ کے حساب سے کمی واقع ہورہی ہے۔ مثلاً تمر کے جنگلات کا رقبہ ۱,۸۵۰ ملین ایکڑ سے کم ہو کر ۱۰۰۰ ملین ایکڑ رہ گیا ہے جس کی وجہ سے سمندری سیلاب کی تباہ کاری بڑھی ہے۔[۱۹] یہ صورتحال صرف پاکستان تک محدود نہیں ہے۔ یورپ کے دیگر ممالک کی طرح جرمنی میں پچھلے سال شدید سیلاب آئے اور اس سال شدید خشک سالی۔ ان ماحولیاتی تبدیلیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جرمنی کے موسمیاتی سروس سے وابستہ ایک ماہر نے کہا ''سب سے اہم بات یہ ہے کہ شدید موسم اتنے کم وقفوں سے وقوع پزیر ہورہے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آب و ہوا میں توازن (باقی) نہیں رہا ہے۔ پچھلے سال جرمنی پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اب ہمیں انسانی یادداشت (تاریخ) کی شدید ترین خشک سالی میں سے ایک کا سامنا ہے۔''[۲۰] اس کا الٹ پاکستان کے لیے درست ہے جہاں کئی سالوں کی خشک سالی کے بعد شدید سیلاب واقع ہوئے ہیں۔

سائنسدان موسمی تغیرات کو گلوبل وارمنگ یعنی عالمی سطح پر گرمی میں شدت سے بھی جوڑتے ہیں۔ ایک سائنسدان نے کہا کہ اس طرح کی صورتحال کا ۲۰ سے ۳۰ سال کے عرصہ میں وقوع پزیر ہونے کی توقع تو تھی مگر یہ تبدیلی سال ۲۰۰۳ء میں واقع ہوجائے گی، اس کا یقین نہیں تھا۔ عالمی سطح پر شدید گرمی نے کچھ مقامات پر مون سون میں شدت پیدا کرنے کے لیے راستہ ہموار کیا اور اس کا اظہار برصغیر میں ہونے والی شدید بارش اور سیلاب ہوسکتے ہیں۔

عالمی سطح پر اقوام متحدہ کی طرف سے ماحول اور ترقی کے جائزہ کے لیے تشکیل کردہ کمیشن اپنی رپورٹ میں حکومتوں اور بین الاقوامی اداروں کے اس اعتراف کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ماحولیاتی مسائل کو معاشی ترقی سے جدا کرنا ممکن نہیں ہے۔ کمیشن کا خیال ہے کہ دنیا میں غربت اور عالمی سطح پر موجودہ عدم مساوات کو حل کیے بغیر ماحولیاتی مسائل سے نمٹنے کی تمام کوششیں رائیگاں جائیں گی۔[۲۱] کمیشن کے سربراہ اعتراف کرتے ہیں کہ ''صنعتی ممالک کی ترقی کے لیے اپنائے گئے راستوں میں سے بہت سارے واضح طور پر غیر پائیدار (طریقے) ہیں۔'' آزاد تجارت میں تیزی کے

باعث ۱۰ سال کے عرصہ میں دنیا ۱۰ فیصد جنگلات سے محروم ہوئی اور امیر ممالک میں کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس میں ۳۳ فیصد اضافہ متوقع ہے۔ ۲۲ امیر ممالک اپنی صنعتوں کو ہزار ملین ڈالرز سالانہ چھوٹ فراہم کرتے ہیں جس میں ماحول میں خطرناک گیسوں کا اضافہ کرنے والی صنعتوں کو ۵۷ بلین ڈالرز دیے جاتے ہیں۔ یہ رقم حیرت انگیز طور پر اس رقم کے مساوی ہے جو عالمی سطح پر ان گیسوں کی مقدار پر قابو پانے کے لیے درکار ہے۔ ۲۲ ۱۹۸۰ء سے آزاد تجارتی معاشی پالیسیوں کی وجہ سے عالمی سطح پر غربت اور ماحولیاتی تباہ کاری کا عمل تیز تر ہوگیا ہے۔ عام طور پر تجارت کی آزادی کو ماحول کے لیے نقصان دہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ زیادہ بین الاقوامی تجارت کے معنی زیادہ ہوائی، سمندری اور زمینی مواصلاتی ذرائع کا استعمال ہے۔ اس کی مثال شمالی امریکہ کے ممالک کے درمیان آزاد تجارت کا معاہدہ نافٹا (این اے ایف ٹی اے) ہے، جس سے دس سال (۲۰۰۵ء-۱۹۹۵ء) کے درمیان ٹرکوں کے ذریعے نقل وحمل میں ۷ گنا اضافہ ہوگا۔ ۲۳ آزاد تجارت کے نظریات کے پیچھے بین الاقوامی تجارتی کمپنیوں، عالمی مالیاتی اداروں اور معاشی وفوجی طور پر طاقتور سرمایہ دار ممالک کا ہاتھ ہے، خاص طور پر امریکہ۔ اس لیے گلوبلائزیشن کا دوسرا نام سامراجیت ہے۔ یہی ''عالمی حکمرانی'' کے نئے نظام کو تشکیل دیتا ہے۔ ۲۴ مثلاً عالمی بینک اپنے قرضہ جات کا ۴۶ فیصد نجی کمپنیوں کو دیتا ہے جس میں سے اکثریت کا تعلق جی-۸ کے ممالک سے ہے۔ امریکہ اوزون کو نقصان پہنچانے والی مجموعی گیسوں کا تیسرا حصہ پیدا کرتا ہے، نہ صرف ان گیسوں میں مسلسل اضافہ کررہا ہے بلکہ ۱۹۹۷ء میں طے پائے جانے والے ایک معاہدہ (کیوٹو پروٹوکول) کی منظوری سے انکار کے باعث پوری انسانیت کی بقاء کو خطرات سے دوچار کرنے پر تلا ہوا ہے۔

پاکستانی عوام ایک طرف خشک سالی اور سیلاب جیسے ''قدرتی'' آفات سے تو دوسری طرف ریاستی پالیسیوں سے بری طرح متاثر ہورہی ہے۔ جبکہ قدرتی آفات کو بھی مقامی اور عالمی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں سے جدا نہیں کیا جاسکتا جن کی وکالت عالمی طاقتیں اور ان کے نمائندے یعنی عالمی مالیاتی وتجارتی ادارے کرتے ہیں۔ اس طرح مجموعی طور پر پاکستانی حالات چاہے وہ ماحولیاتی، معاشی، سماجی یا قدرتی ہوں ایک طرف مقامی اور دوسری طرف عالمی حالات اور تبدیلیوں کا ناگزیر نتیجہ ہیں۔ سرمایہ دارانہ ترقی کے باعث مقامی اور عالمی سطح پر بڑھتی ہوئی غربت اور عدم مساوات اور ماحولیاتی تباہی، موجودہ نظام سے چھٹکارا پانے کے لیے سب سے بڑی دلیل ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ ڈان، ۱۹، جون ۲۰۰۳ء۔
۲۔ جنگ، ۲۶، نومبر ۲۰۰۲ء۔
۳۔ دی نیوز، ۱۲، جون ۲۰۰۳ء۔
۴۔ دی نیوز، ۳۰، جولائی ۲۰۰۳ء، صفحہ ۸۔
۵۔ ڈان، ۸، اگست ۲۰۰۳ء، صفحہ ۵۔
۶۔ ڈان، ۱۱، اگست ۲۰۰۳ء، صفحہ ۱۷۔
۷۔ ڈان، یکم، اگست ۲۰۰۳ء، صفحہ ۲۱۔
۸۔ ڈان، ۴، اگست ۲۰۰۳ء، صفحہ ۴۔
۹۔ ڈان، ۱۱، اگست ۲۰۰۳ء، صفحہ ۳۔
۱۰۔ دی نیوز، ۱۲، جون ۲۰۰۳ء۔
۱۱۔ دی نیوز، ۱۲، جون ۲۰۰۳ء۔
۱۲۔ ڈان، یکم، فروری ۲۰۰۳ء۔
۱۳۔ دی نیوز، ۲۱، جون ۲۰۰۲ء۔
۱۴۔ شفقت منیر اینڈ ارشد خورشید (ایڈیٹر) اسٹیٹ آف دی انوائرمنٹ رپورٹ فار پاکستان، ایس ڈی پی آئی، اسلام آباد، ۲۰۰۱ء۔
۱۵۔ زیبسٹ سی آئی آر، سوشیو اکنامک ایمپیکٹ آف سائکلون ۰۲ اے، آن کوسٹل سندھ، اسٹڈی رپورٹ، زیبسٹ سنٹر فار انفارمیشن اینڈ ریسرچ کراچی، ۱۹۹۹ء، صفحہ ۱۷۔
۱۶۔ دی نیوز، ۲۳، مارچ ۲۰۰۳ء۔
۱۷۔ ڈاکٹر مرزا ارشد علی بیگ، مون سون ڈسٹربنس اینڈ اٹس ایمپیکٹ، ڈان اکنامک اینڈ بزنس ریویو، ۹ تا ۱۵، ستمبر ۲۰۰۲ء۔
۱۸۔ منیر اور خورشید (ایڈیٹر) صفحہ ۲۴، ایضاً۔
۱۹۔ ڈان، ۲۴، جون ۲۰۰۳ء۔
۲۰۔ جان وائیڈل، گارجین رڈان، ۱۷، اگست ۲۰۰۳ء، صفحہ ۱۴۔
۲۱۔ ورلڈ ٹریڈ کمیشن آن انوائرمنٹ اینڈ ڈیولپمنٹ، اوور کامن فیوچر، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، نیو یارک، ۱۹۹۱ء، صفحہ ۳۔
۲۲۔ ایما برکم اور جان کارلٹن (ایڈیٹرز)، اینٹی کیپٹلزم-اے گائیڈ ٹو دی مومنٹ میں سوزن جارج، کارپوریٹ گلوبلائزیشن، بک مارکس پبلکیشنز لمیٹڈ، ۲۰۰۱ء۔
۲۳۔ ایما برکم اور جان کارلٹن (ایڈیٹرز)، اینٹی کیپٹلزم میں رونی ہال، انوائرمنٹ، صفحہ ۶۰۔
۲۴۔ جیمس پٹراس اینڈ ہنری ویلٹ میئر، گلوبلائزیشن ان ماسکڈ: ایمپیریلزم ان دی ٹوئنٹی فرسٹ سنچری، میڈھم بوکس، ہندوستان، ۲۰۰۱ء، صفحہ ۱۲۔

زہر صرف زہر ہے![*]

خائستہ محمد

کیڑے مار ادویات بنانے والی بین الاقوامی کمپنیوں کا کہنا ہے کہ زرعی کیڑے مار ادویات کے استعمال سے فصلیں محفوظ ہوتی ہیں۔ پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے، غربت میں کمی اور کسانوں کی زندگی میں بہتر تبدیلی واقع ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ کیڑے مار ادویات تیار کرنے والی مقامی اور بین الاقوامی کمپنیوں کو نہ تو انسانی زندگی کی بہتری سے اور نہ ہی غربت میں کمی سے کوئی سروکار ہے بلکہ ان کا مقصد صرف منافع کمانا ہے۔ اگر کمپنیوں کا مقصد انسان اور ماحول کی بہتری یا غربت میں کمی ہوتا تو وہ ان ہزاروں تحقیقات کو ہرگز نظر انداز نہیں کرتیں، جو ثابت کرتی ہیں کہ کیڑے مار ادویات جانداروں کی صحت اور ماحول کے لیے شدید نقصاندہ ہیں۔

چند دن پہلے تک حیدرآباد کے ایک تعلقہ ٹنڈو محمد خان میں بھنڈی کی فصل پر زہریلی ادویات کا چھڑکاؤ کیا جاتا رہا۔ یہ اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہیں کہ ان متاثرہ سبزیوں کو استعمال میں لانے والوں کا کیا حشر ہوا ہوگا! تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ بھنڈی، بیگن اور لوکی جیسی عام سبزیوں میں متعین شرح سے بھی زیادہ مقدار میں کیڑے مار ادویات کی باقیات پائی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ سیب اور کھلی میں بھی اس کی خطرناک مقدار ملنے کی تصدیق ہوئی ہے۔[1] کیڑے مار ادویات سے نا صرف بیماریوں میں اضافہ ہو رہا ہے بلکہ اموات بھی واقع ہوتی ہیں۔

تیسری دنیا کے دیگر ممالک کی طرح پاکستان میں بھی مزدور کسان عورتوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ کھیتوں میں مستقل کام کرنے کی وجہ سے ان پر کیڑے مار ادویات کا اثر بھی زیادہ پڑتا ہے۔ عورت بچے کو نو ماہ اپنے رحم میں پالتی ہے اس لیے کیڑے مار ادویات کا اثر عورت کے حوالے سے مزید تشویش ناک ہے۔ ماں کے پیٹ میں بچہ ان زہریلی ادویات سے جسمانی اور ذہنی لحاظ سے متاثر ہوسکتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق پاکستان کے کپاس پیدا کرنے والے نو بڑے اضلاع میں ۲۶ لاکھ عورتیں کپاس چننے کے کام سے وابستہ ہیں۔ اس طرح نا صرف یہ عورتیں بلکہ ہماری آنے والی نسلیں بھی ادویات کے زہر سے محفوظ نہیں۔[2]

پاکستان میں ۷۶ فیصد کیڑے مار ادویات صرف کپاس پر استعمال کی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کیڑے مار ادویات کے زہر سے متاثرہ افراد میں کپاس کی فصل سے متاثر ہونے والوں کی تعداد ایک تہائی ہے۔ لیکن اکثریت اپنی بیماری کی وجہ کیڑے مار ادویات سے نہیں جوڑتی۔[3] یہی وجہ ہے کہ کسان اکثر چھڑکاؤ کرنے کے بعد خالی بوتلوں کو کھیتوں میں پھینک دیتے ہیں یا نہر اور تالابوں کے قریب چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ زہریلی ادویات کی بوتلیں بچے کھیلنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ نتیجتاً یا تو بچے جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں یا مختلف بیماریوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ اس سال کا سب سے بڑا واقع ہالا، ضلع حیدرآباد کے قریب پیش آیا، جس میں تین بچوں نے، جو کہ آپس میں بھائی بھی تھے، نہر کے پاس پڑی زہریلی دوا کی بوتل میں پانی ڈال کر پی گئے اور زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

اس کے علاوہ یہ بوتلیں اور ڈبے گاؤں میں عورتیں نمک، مرچ، چینی، مصالحے اور چائے کی پتی رکھنے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ ٹنڈو محمد خان کے ۶ گوٹھوں میں کئی گھرانوں کے باورچی خانہ کا معائنہ کیا گیا تو کیڑے مار ادویات کی بے شمار بوتلیں پائی گئیں۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عام لوگ کیڑے مار ادویات کے زہریلے

کیڑے مار ادویات کے استعمال اور نقصانات پر تازہ ترین تحقیق

اس سال کے آغاز میں انوائرمینٹل جسٹس فاؤنڈیشن نامی ادارے نے ایک رپورٹ جاری کی جس کے مطابق کیڑے مار ادویات سے:

- دماغ، چھاتی، جگر، پیٹ، مثانہ، گردے، لبلبہ، پھیپھڑے اور عورت کے بیضہ دانی کا کینسر لاحق ہوتا ہے۔
- نشو ونما میں بے قاعدگی، پیدائشی نقائص، مدافعاتی اور اعصابی بیماریوں کے علاوہ اچانک موت واقع ہوسکتی ہے۔
- کھیتی باڑی سے منسلک بچوں کی بڑی تعداد متاثر ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ ان کی کیڑے مار ادویات تک رسائی بہت آسان ہوتی ہے۔ تحقیق میں عالمی ادارہ خوراک وزراعت کے کمبوڈیا میں جائزہ کا حوالہ دیا گیا ہے جہاں آدھے کسانوں نے بتایا کہ ان کے بچے فصلوں پر کیڑے مار ادویات کا چھڑکاؤ کرتے ہیں۔
- برازیل کے وزارت صحت کے مطابق سال ۲۰۰۰ میں کیڑے مار ادویات کی وجہ سے ۳ لاکھ افراد زہریلی ادویات کے شکار ہوئے اور ۵ ہزار اموات کا اندازہ لگایا گیا۔ کیڑے مار ادویات کے شکار افراد کے علاج معالجہ اور کام سے غیر حاضری کی صورت میں ہونے والے نقصانات کا تخمینہ ۵۴۰ ملین ڈالرز لگایا گیا ہے۔
- ترقی پزیر ممالک میں ۶۰ تا ۸۰ فیصد خوراک کی پیداوار عورتوں کی مرہون منت ہے۔ یہی نہیں بلکہ مردوں کے آلودہ کپڑے، چھڑکاؤ والے ڈبے اور اوزار کی صفائی بھی عورتیں ہی کرتی ہیں۔ حاملہ عورتوں کے کیڑے مار ادویات سے متاثر ہونے کی صورت میں پیٹ میں پرورش پانے والے بچے کے مائعات پیدا کرنے والے نظام میں گڑبڑ پیدا ہونے کے خدشات کا اظہار کرنے کے علاوہ ماں کے دودھ کے آلودہ ہونے کے بارے میں بھی بتایا گیا ہے۔

۲۱، اپریل ۲۰۰۳ انوائرمینٹل جسٹس فاؤنڈیشن

* چیلنج، اپریل تا جون ۲۰۰۳ء، صفحہ ۱۵ تا ۱۶۔

پن سے کس حد تک بے خبر ہیں۔

ایک خبر کے مطابق ہوسٹری موڑ، حیدر آباد کے قریب ایک ہاری کیڑے مار دوا کا چھڑکاؤ کرتے ہوئے بے ہوش ہوا اور کسی طبی امداد یا اسپتال لے جانے سے قبل ہی اس کی موت واقع ہوگئی۔[۴] اگرچہ اخبارات میں کیڑے مار ادویات سے شکار ہونے والوں کے بارے میں خبروں کا اضافہ ہورہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بڑی تعداد میں خبریں اخبارات میں چھپتی ہی نہیں۔ اسی طرح کا ایک واقعہ حال ہی میں ٹنڈو محمد خان سے ملحقہ گاؤں میں رونما ہوا۔ ایک ۱۹ سالہ نوجوان نے بیروزگاری سے تنگ آ کر زہریلی دوا پی لی۔ بروقت طبی امداد ملنے کے باعث اس کی زندگی بچ گئی۔ اس واقعہ کا اندراج کہیں نہیں ہے۔ ایسے سینکڑوں مزید واقعات کی مثالیں موجود ہیں۔

عالمی اور مقامی سطح پر ہونے والی تحقیقات اور رونما ہونے والے واقعات اور نقصانات میں اضافے کو سامنے رکھتے ہوئے کیڑے مار ادویات کی تیاری، تجارت اور استعمال پر پابندی لگاتے ہوئے ان کمپنیوں کے خلاف کاروائی ہونی چاہیے جو کہ صرف منافع کمانے کی لالچ میں انسانی جانوں اور ماحول کو تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ گورنمنٹ آف پاکستان، یو این ڈی پی/ایف اے او، ''پیسٹی سائیڈ ریفارم فار فوڈ سیکورٹی ان پاکستان''، صفحہ نمبر ۱۴۔

۲۔ ایضاً، صفحہ نمبر ۱۵۔

۳۔ سیما طاہر، پیسٹی سائیڈ ایفیکٹ آن ہیومن ہیلتھ ان پاکستان فوڈ اینڈ ایگری کلچر، آرگنائزیشن صفحہ ۱۱۔

۴۔ جنگ، ۵، جولائی ۲۰۰۳۔

دوسری عالمی کانفرنس برائے پائیدار ترقی*

چیلنج رپورٹ

۲۶، اگست تا ۴، ستمبر ۲۰۰۲ء تک جنوبی افریقہ کے شہر جہانسبرگ میں عالمی کانفرنس برائے پائیدار ترقی (ڈبلیو ایس ایس ڈی) منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کے انعقاد کا بنیادی مقصد ۱۰ سال قبل منعقد ہونے والی ریو عالمی کانفرنس میں متعین مقاصد اور ان مقاصد کے حصول کی طرف کیے گئے اقدامات کا جائزہ لینا اور نئی حکمت عملیاں طے کرنا تھا۔ اس کانفرنس میں ۱۰۰ سے زائد سربراہان مملکت کے علاوہ ۱۸۵ ملکوں سے آئے ہوئے تقریباً ۶۵,۰۰۰ مندوبین شریک ہوئے۔

تجزیہ نگار عالمی کانفرنس کو ایک ناکام کانفرنس قرار دے رہے ہیں اور اس حوالے سے مختلف دلائل بھی پیش کر رہے ہیں، جن میں سب سے سخت تنقید بین الاقوامی کمپنیوں مثلاً شیل، میکڈونلڈز، نائیکی سمیت و دیگر کمپنیوں کا عالمی کانفرنس میں بھرپور کردار ہے۔ ماضی میں ماحولیات کو شدید نقصان پہنچانے کی ذمہ دار قرار دیے جانے والی بین الاقوامی کمپنیاں اب ماحولیات کے بچاؤ اور پائیدار ترقی میں اپنا کردار ادا کرنے میں بظاہر پیش پیش نظر آتی ہیں۔

حالیہ عالمی کانفرنس میں حکومتی اور نجی شراکت داری پر کافی حد تک زور دیا گیا ہے اور اس سے بڑی امیدیں بھی وابستہ کی جا رہی ہیں۔ اگرچہ یہ کانفرنس انسانی اور ماحولیاتی بہتری جیسے اقدامات کے تناظر میں منعقد کی گئی لیکن ان مقاصد کا حصول مشکل تر ہو گیا ہے کیونکہ کانفرنس کی تشکیل انہی قوتوں کے زیر اثر ہوئی، جو بڑھتی ہوئی غربت اور ماحولیاتی تباہی کی ذمہ دار ہیں۔ اس کا اندازہ کانفرنس کے پس منظر میں کام کرنے والی بین الاقوامی کمپنیاں، بینک اور تجارتی تنظیموں کی نمائندہ تنظیم ورلڈ بزنس کونسل اور اس کی تخلیق کردہ بزنس ایکشن برائے پائیدار ترقی، جو کہ عالمی چیمبر آف کامرس کے اشتراک سے قیام پذیر ہوا، کا بھرپور کردار ہے۔ ورلڈ بزنس کونسل میں ۳۰ ممالک کے ۲۰ شعبوں سے تعلق رکھنے والی ۱۶۰ بین الاقوامی کمپنیاں شامل ہیں۔ اس تنظیم کے مطابق ''۱۹۹۲ء ریو کانفرنس میں تاجر برادری کی تجاویز کو اہمیت دی گئی تھی۔ اسی طرح ہم چاہتے ہیں کہ آج دس سال بعد بھی تاجر برادری کے نقطہ نظر کو نہ صرف سنا جائے بلکہ اسے سمجھنے کے ساتھ ساتھ اس پر عمل بھی کیا جائے''[1] پائیدار ترقی کی کانفرنس کے انعقاد سے ایک سال قبل بزنس ایکشن برائے پائیدار ترقی سے تعلق رکھنے والے ۱۴۰ کمپنیوں کے سربراہ پیرس میں جمع ہوئے۔ انہوں نے کانفرنس کی تشکیل اور ایجنڈا طے کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

دنیا میں ماحولیاتی تباہ کاری اور انسانوں کو درپیش مسائل مثلاً زمین، پانی، ہوا، پہاڑ کو درپیش خطرات اور غربت و افلاس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بھوک اور امراض انہی بڑی بین الاقوامی کمپنیوں کی پیدا کردہ ہیں جو زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کی خودغرضانہ خواہش میں دنیا کو انسان سمیت تمام جانداروں کے لیے پرخطر مقام بنانے پر تلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مثلاً یونین کاربائیڈ بھوپال میں ماحولیاتی تباہ کاری، شیل نائیجیریا میں زمینوں کو آلودہ کرنے اور بائر کی ایک زہریلی دوا کے باعث پیرو میں ۲۴ بچوں کی ہلاکت کی ذمہ دار ہے۔

پائیدار ترقی کا بیڑا اٹھانے والے ادارے اقوام متحدہ کی تمام تر توجہ سرکاری اور نجی شراکت داری پر ہے جس کا مظاہرہ حالیہ عالمی کانفرنس میں بھی دیکھنے میں آیا۔ کانفرنس کے دوران اقوام متحدہ نے ۲۰۰ سے زیادہ سرکاری رنجی شراکت داری کے معاہدوں کو منظور کیا اور مونیکا لائن، جو کہ اقوام متحدہ میں سرکاری رنجی شراکت داری کی ذمہ دار ہیں، نے امید ظاہر کی ہے کہ ان کی تعداد میں مزید اضافہ ہوگا۔ یہ معاہدے کارپوریشنوں، یونیورسٹیوں اور این جی اوز کے ساتھ طے کیے گئے ہیں تاکہ معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ ماحولیاتی بچاؤ کو بھی ممکن بنایا جا سکے۔ محسوس یہ ہو رہا ہے کہ غریب ممالک کے ماحولیاتی مسائل اور پائیدار ترقی کے حصول کا دارومدار صرف اور صرف نجی اور سرکاری شراکت داری پر ہے۔

سرمایہ دارانہ طریقہ معیشت کے ذریعہ ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیا جا رہا ہے جہاں باہمی رشتہ صرف چیز پیدا کرنے اور اسے استعمال کرنے والے کے گرد سمٹ کر رہ جائے۔ سرمایہ دارانہ طریقہ معیشت میں ایجادات ضرورت کی بنیاد پر نہیں بلکہ ایجادات کی بنیاد پر ضرورت کو محسوس کرایا جاتا ہے۔ میڈیا اور دوسرے ذرائع سے ان ایجادات کو عوام پر زبردستی ٹھونسا جا رہا ہے۔ اس مارکیٹ یا منڈی کی قوی حیثیت ہی کی وجہ سے ہی عالمی ماحولیاتی بحران وجود میں آیا ہے۔

بڑی بڑی کمپنیاں لاکھوں، ہزاروں ڈالرز عالمی کانفرنس کے حوالے سے صرف اسی لیے خرچ کر رہی ہیں تاکہ اپنا اثر ورسوخ استعمال کر سکیں اور پھر اثر ورسوخ کے بل بوتے پر اپنے مفادات کا تحفظ کر سکیں۔ ایک ماحولیاتی کارکن کے مطابق یہ بالکل ویسے ہی ہے جیسے کسی مجرم ہی کو قانونی مسودہ مرتب کرنے کی ذمہ داری سونپ دی جائے۔[2]

مندرجہ بالا حالات دراصل ماحولیات اور پائیدار ترقی میں مزید رکاوٹ کا باعث بن سکتے ہیں کیونکہ دنیا میں غربت کے خاتمہ اور آلودگی سے پاک ماحول کے لیے درکار وسائل پر بڑی بڑی بین الاقوامی کمپنیوں ہی کا قبضہ ہے۔

عالمی سطح پر انسان اور ماحول کو درپیش مسائل کی کوئی بھی کوشش اسی وقت کامیابی سے ہمکنار ہو سکتی ہے، جب وسائل کی منصفانہ تقسیم کے علاوہ مسائل کی بنیادی وجوہات کی نشاندہی جیسے بنیادی سوالات کے جوابات تلاش نہ کیے جائیں۔ موجودہ استحصالی نظام اور اس کے اداروں مثلاً اقوام متحدہ، ڈبلیو ٹی او، آئی ایم ایف، ورلڈ بینک اور بین الاقوامی کمپنیوں کی موجودگی میں انسان اور ماحول کی بہتری ناممکن ہے۔ اس کے لیے ایک انقلابی حکمت عملی کی ضرورت ہے تاکہ ایک نئے نظام کی راہ ہموار کی جا سکے۔

حوالہ جات:

www.wbcsd.ch/summit/why.htm

۲۔ عفت ملک، ٹاسک بی فور جوہانسبرگ، ڈان، ۴، ستمبر ۲۰۰۲ء

* چیلنج، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۲ء، صفحہ ۱۲.

پائیدار ترقی کی جانب منفی اقدامات!*

ولی حیدر

اس سال اگست میں جنوبی افریقہ کے شہر جوہانسبرگ کے مقام پر عالمی کانفرنس برائے پائیدار ترقی (ڈبلیو ایس ایس ڈی) کا انعقاد کیا جارہا ہے۔ اس کانفرنس کا مقصد پائیدار ترقی کو درپیش چیلنجوں کا احاطہ کرنا ہے۔ ۱۹۹۲ء میں ریو، برازیل کے مقام پر اقوام متحدہ کے زیر اہتمام پائیدار ترقی کے موضوع پر ایک سربراہ کانفرنس منعقد کی گئی تھی، جس میں دنیا کے لیے پائیدار ترقی کی اصطلاح از سرنو مرتب کی گئی۔ ریو کانفرنس میں مختلف معاہدے اور پائیدار ترقی کے لیے اقدامات کی نشاندہی کی گئی۔ جوہانسبرگ میں ریو کانفرنس میں کیے گئے اقدامات کا جائزہ لیا جائے گا اور مستقبل کے لیے حکمت عملی مرتب کی جائے۔

ڈبلیو ایس ایس ڈی کے حوالے سے ہر ملک میں مشاورتی اجلاس منعقد کیے جارہے ہیں تاکہ عوامی مسائل حکومت کے تیار کردہ مسودے میں شامل کرکے ڈبلیو ایس ایس ڈی تک پہنچائے جاسکے۔ مستقبل کے بارے میں فیصلے کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ریو کانفرنس کے انعقاد اور اس میں ہونے والے فیصلوں اور اس ضمن میں ہونے والے اقدامات پر ایک نظر ڈالی جائے۔

۱۹۷۰ء کی دہائی کے بعد اس تنقید میں اضافہ ہوا کہ سرمایہ دارانہ ترقی کے باعث انسانوں کا اپنا وجود اور کرہ ارض، دونوں ہی خطرے سے دو چار ہیں۔ ۱۹۸۲ء میں عالمی کمیشن برائے ماحولیات اور ترقی نے بھی اس کی نشاندہی کی کہ جتنی تیزی سے دنیا میں پیداوار بڑھ رہی ہے اتنی ہی تیزی سے دنیا میں بھوک وافلاس میں بھی اضافہ ہورہا ہے۔ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک سے وابستہ ۳۰ فیصد آبادی دنیا کے ۷۰ فیصد وسائل کا استعمال کرتی ہے جبکہ ترقی پذیر ممالک کی ۷۰ فیصد آبادی کے پاس صرف ۳۰ فیصد وسائل موجود ہیں۔ ان وجوہات کی بناء پر ترقی کو ہی چیلنج کیا گیا ہے اور ایسی منصوبہ بندی اور ماڈل کی ضرورت محسوس کی گئی جس میں بحیثیت مجموعی انسانی اور ماحولیاتی فلاح و بہبود کو مدنظر رکھا گیا ہو۔ ان ہی وجوہات کی بناء پر روایتی ترقی کے بجائے پائیدار ترقی کا تصور ابھر کر سامنے آیا۔ پائیدار ترقی کا ایک باضابطہ تعارف برانڈٹ رپورٹ ۱۹۸۰ء میں پیش کیا گیا ''ایسی ترقی جو حال کی ضروریات سے اس طرح عہدہ براہ ہو کہ اس سے آئندہ آنے والی نسلوں کی ضروریات کی صلاحیت متاثر نہ ہونے پائے'' اس تعریف سے چند اہم نکات سامنے آتے ہیں۔

ماحولیات، معاشرے اور معیشت کے درمیان تعلق پیدا کرنے کی اشد ضرورت ہے کیونکہ اب تک ہونے والی ترقی کی بنیاد نہ صرف مستقبل سے مطابقت نہیں رکھتی بلکہ عوامی اور ماحولیاتی لحاظ سے بھی موثر ثابت نہیں ہوئی ہے۔ اگر سرمایہ دارانہ ترقی کا تاریخی جائزہ لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ ترقی کا بنیادی مقصد کاروبار کی ترقی کی بنیاد پر منافع کا حصول ہے۔ آج سرمایہ دارانہ نظام پر دو حوالوں سے خاص طور پر تنقید ہورہی ہے اول غربت میں بڑھتا ہوا اضافہ اور دوئم ماحولیاتی مسائل کی وجہ سے کرہ ارض کا انسان سمیت دیگر جانداروں کی زندہ رہنے کے لیے تنگ ہوتا ہوا دامن ہے۔ سرمایہ دارانہ ترقی کے صنعتی اور زرعی انقلابات کے باعث ایک طرف عوام کے بجائے ایک مختصر طبقے کا اقتدار مضبوط ہوا تو دوسری طرف ماحولیاتی آلودگی میں اس قدر اضافہ ہوا کہ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں یہ تنقید علمی حلقوں کا دائرہ توڑتے ہوئے عوام الناس کے دائرے میں داخل ہوئی۔ اس تنقید کی بنیاد پر ریو کانفرنس میں ایک حکمت عملی کا مسودہ تیار کیا گیا جسے ایجنڈا ۲۱ کا نام دیا گیا ہے۔ اس ایجنڈے میں تین اہم موضوعات کی نشاندہی کی گئی ہے:

گلوبلائزیشن اور عالمی کانفرنس برائے پائیدار ترقی:

اس سال اگست میں جنوبی افریقہ کے شہر جوہانسبرگ میں عالمی کانفرنس برائے پائیدار ترقی (ڈبلیو ایس ایس ڈی) منعقد ہونے والی ہے۔ اس کانفرنس سے قبل دنیا کے صنعتی طور پر ترقی یافتہ آٹھ ممالک کی تنظیم جی-۸ کے وزراء کی پہلی کانفرنس جون ۲۶ اور ۲۷ کو منعقد ہوگی۔ ان دو اجلاسوں کی تیاری کے سلسلے میں جی-۸ کے ممالک کا ایک اجلاس کینیڈا میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کی خفیہ کاروائی میں زیر غور آنے والے مسودے کی ایک نقل کونسل آف کینیڈینز نامی تنظیم نے جاری کی ہے جو جی-۸ ممالک کے وزراء برائے ماحولیات کی طرف سے عالمی کانفرنس برائے پائیدار ترقی کے بارے میں ان کے موقف پر مبنی تجاویز پر مشتمل ہے۔ اس مسودہ سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح صنعتی ممالک کے وزرائے ماحولیات، ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کے بڑی بڑی کارپوریشنوں کے مفادات کا تحفظ کرنے والا ایجنڈا، عالمی کانفرنس برائے پائیدار ترقی کے اجلاس کے موقع پر دنیا بھر کے ممالک پر تھوپا جائے گا۔

پورے مسودہ میں پائیدار ترقی کو گلوبلائزیشن سے جوڑنے کی ضرورت پر توجہ مرکوز کی گئی ہے مثلاً مسودہ میں لکھا ہے ''یہ (کانفرنس) نیویارک میں (اقوام متحدہ کے زیر اہتمام) ہزاری اجلاس، دوہا میں ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کے تحت بات چیت اور مالیات برائے ترقی کانفرنس، مونٹرے کے دوران حاصل ہونے والے مثبت نتائج کے ملاپ کا نقطہ ہونا چاہیے'' اس پر تبصرہ کرتے ہوئے دی کونسل آف کینیڈینز کے چیئرمین نے کہا ''یہ دیکھ کر انتہائی دکھ ہوتا ہے کہ جی-۸ کے وزراء برائے ماحولیات دنیا کی ماحولیات کو کارپوریٹ گلوبلائزیشن کے ماتحت لانے کی منصوبہ بندی کررہے ہیں۔ دنیا کا ماحولیاتی بحران شدید ہوتا جارہا ہے۔ جس بات کا وہ عہد کرنے جارہے ہیں وہ اسی گلوبلائزیشن کا پھیلاؤ ہے جو ماحولیاتی بحران کی وجہ ہے۔''

ایک اور عہدے دار نے کہا ''ہر دفعہ تجارتی معاہدوں کے مواقع پر ماحولیات کے مسئلہ کو زیر غور لایا جاتا ہے لیکن ماحول تباہ ہورہا ہے۔ یہ کرہ ارض کے مستقبل کیلئے بہت برا شگون ہے۔ جی-۸ کے ممالک، یہ کوشش کررہے ہیں کہ کسی طرح ماحول کو تحفظ دینے کی حکومتی قوت کو محدود کرنا ہے۔ درحقیقت جی-۸، ڈبلیو ٹی او کے ایگزیکٹو کی حیثیت سے کام کرتا ہے اور جو واضح طور پر اس بات کو یقینی بنانا چاہتا ہے کہ ماحولیاتی معاملات کسی طرح کارپوریشنوں کے منافع جات کو محدود کرنے نہ پائے۔''

ڈبلیو ٹی او کے دوہا مذاکرات میں جی-۸ کامیابی کے ساتھ پانی اور ماحولیات کی خدمات کو از سرنو تبدیل کرنے اور کارپوریشنوں کے کنٹرول میں لانے پر زور دیتے رہے ہیں۔

کانسل آف کینیڈین پریس ریلیز: جی-۸ اینوائرمنٹ منسٹرز سیل آؤٹ ٹو گلوبل ٹریڈ ایجنڈا، ۱۲ اپریل، ۲۰۰۲، ڈبیٹ لسٹ سرور (debate@sunsite.wits.ac.za)

* چیلنج، جنوری تا مارچ ۲۰۰۲ء، صفحہ ۱۱ تا ۱۵۔

۱۔ معاشی اور سماجی حوالے سے چند اہم نکات پر زور دیا گیا: مثلاً غربت کا خاتمہ، امیر اور غریب ممالک میں اشیاء کے استعمال میں توازن، صحت کی حفاظت اور بہتری، انسانی رہائش کے لیے صاف اور محفوظ آبادیاں وغیرہ۔

۲۔ ماحولیاتی وسائل کا تحفظ اور صحیح استعمال: مثلاً جنگلات کا تحفظ، کرہ ارض کی پائیدار حفاظت اور انتظام، پائیدار زرعی اور دیہی ترقی، تحفظ حیاتیات، خطرناک فضلات اور زہریلی کیمیائی اجزاء کا محفوظ انتظام اور استعمال وغیرہ۔

۳۔ کرہ ارض کے مختلف گروہوں کی پائیدار ترقی پر بھی زور دیا گیا جن میں عورتیں، بچے، قدیم مقامی باشندے، مزدور اور کسان شامل ہیں۔

ان تین اہم موضوعات کی نشاندہی کے علاوہ کانفرنس کے دوران دو انتہائی اہم کنونشن اقوام متحدہ میں شامل کیے گئے جو

۱۔ کنونشن برائے موسمیاتی تبدیلی۔

۲۔ کنونشن برائے حیاتیاتی پھیلاؤ (بائیوڈائیورسٹی) کہلاتے ہیں۔

ڈبلیو ایس ایس ڈی کے انعقاد کا بنیادی مقصد ریو کانفرنس کے بعد سے لے کر اب تک پچھلے دس سالوں کے درمیان کیے گئے اقدامات اور عالمی ماحولیاتی صورتحال کا جائزہ ہے جو کہ مختلف ملکوں اور اداروں نے پائیدار ترقی کے حوالے سے کیے ہیں، لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اس بات کو پرکھا جائے کہ پائیدار ترقی کے ضمن میں دیے گئے اقدامات کی طرف پیش قدمی کس رفتار سے ہو رہی ہے؟ اور یہ کہ آج انسان کو بھوک و افلاس اور ماحولیاتی مسائل سے نمٹنے میں کس قدر کامیابی حاصل ہوئی ہے اور مستقبل میں ان مسائل سے نمٹنے میں کامیابی کے امکانات کتنے ہیں؟

وہ تمام حقائق جن کا عالمی کمیشن برائے ماحولیات اور ترقی ۱۹۸۰ء نے جامع رپورٹ میں نشاندہی کی تھی مثلاً ملکوں کے درمیان، معاشی آزادی، ماحولیاتی آزادی، ممالک کے درمیان مقامی وسائل پر انحصار اور ان کا درست استعمال وغیرہ جیسے اہم نکات آج ۲۰ سال بعد بھی بالکل اسی طرح سے نظر آ رہے ہیں۔

۱۹۹۲ء میں ہونے والی پائیدار ترقی کی کانفرنس میں بھی پائیدار ترقی کے لیے ان ہی اصولوں پر عملدرآمد پر زور دیا گیا تھا اور ایسی پالیسیوں کو مرتب کرنے کا خیال پیش کیا گیا تھا کہ جس سے ملکوں کی معیشت مستحکم ہو کیونکہ جب تک کسی ملک کی معیشت مستحکم نہیں ہوگی اس وقت تک وہاں پائیدار ترقی ممکن نہیں ہے۔ مگر آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ملکوں کو اپنی مرضی کے مطابق معاشی پالیسیاں بنانے سے روکا جا رہا ہے۔ ریو کانفرنس کے تحت ایجنڈا ۲۱ میں یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ امیر ممالک، غریب ممالک کو اپنی پیداوار کا ۷ء۰ فیصد رقم ایجنڈا ۲۱ کو پائے تکمیل تک پہنچانے کے لیے فراہم کریں گے۔ اس وعدے کی سراسر خلاف ورزی ہوتی رہی ہے اور اس وقت اس کی شرح ۲ء۰ فیصد ہے امریکہ اس وقت ۵۰ بلین ڈالرز فراہم کر رہا ہے جبکہ وعدہ ۱۷۵ بلین ڈالرز کا تھا۔ اس کے علاوہ ۲۰۰۲ء میں مونٹرے، میکسیکو میں ہونے والی اقوام متحدہ کی کانفرنس مالیات برائے ترقی میں امریکہ نے واضح کر دیا کہ وہ اپنے ایجنڈا ۲۱ کے تحت مالیاتی مدد کا وعدہ برائے پائیدار ترقی اسی حال میں پورے کرنے پر غور کریگا جب تمام ممالک سرمایہ دارانہ آزاد تجارت کے اصولوں کو اپنانے پر پابند ہوں۔

اس کے علاوہ ۲۰۰۱ء میں ہونے والی اقوام متحدہ کی کانفرنس برائے موسمیاتی تبدیلی میں امریکہ نے اس کنونشن (جو کہ ریو کانفرنس کا حصہ ہے) کی تصدیق کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ اب اپنے کیے ہوئے وعدوں سے پیچھے ہٹ رہا ہے۔ امریکہ کا خیال ہے کہ اگر وہ اپنے وعدے پورے کرتا ہے تو اس کی صنعت کو کئی بلین ڈالرز کا نقصان ہوگا اور ۵۰ لاکھ افراد بیروزگار ہو جائیں گے۔ اصل میں ماحولیات کو سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والے ممالک صنعتی طور پر زیادہ ترقی یافتہ ہیں مثلاً امریکہ دنیا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی کل مقدار کا ۳۳ فیصد اور یورپ ۲۰ فیصد فضا میں خارج کرتے ہیں، جو اوزون کے لیے سب سے زیادہ خطرناک گیس شمار کی جاتی ہے۔ دنیا کی یہ بڑی بڑی کمپنیاں ہی دن بہ دن بگڑتے ہوئے ماحولیاتی آلودگی کی ذمہ دار ہیں۔ بین الاقوامی کارپوریشنیں کس طرح ماحولیات اور اس کی روک تھام کرنے کی غرض سے منعقد کانفرنسوں پر اثر انداز اور انہیں سبوتاژ کرتی ہیں اس کا اندازہ ۱۹۹۷ء کی جاپان میں ہونے والی کیوٹو کانفرنس کے موقع پر دیکھنے میں آیا جب کارپوریشنوں نے اس کانفرنس کے خلاف چلائی جانے والی اشتہاری مہم پر ۱۳ ملین ڈالرز خرچ کر ڈالے۔ امریکہ کی دونوں بڑی سیاسی پارٹیوں کے ہر ممبر کانگریس اور سینٹ کو فی کس ۵۰ ملین ڈالرز دیے گئے تاکہ وائٹ ہاؤس ان کے منصوبوں کا تحفظ کریں۔ یہی وجہ ہے کہ آج امریکہ نے کیوٹو کانفرنس میں کیے جانے والے وعدوں سے انحراف کیا ہے۔

ریو کانفرنس میں دوسرا اہم کنونشن برائے بائیوڈائیورسٹی (سی بی ڈی) ہر ملک کی حیاتیاتی اور جینیاتی وسائل پر حق خودارادیت کو ترجیح دیتا ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ ان وسائل تک غیر ملکی کمپنیوں اور حکومتوں کی پہنچ سے پہلے اس ملک، جس میں وہ شئے پائی جاتی ہے، کے اعتراضات کو مدنظر رکھنا ضروری قرار دیتا ہے۔ سی بی ڈی مقامی لوگوں، کسانوں، بائیوڈائیورسٹی (حیاتیاتی پھیلاؤ یعنی وہ تمام زندہ اثاثہ جس میں انسان، جانور، پھل، پھول اور ان کا جینیاتی مواد شامل ہے) اور علم کی حفاظت اور مدد کی ضمانت دیتا ہے صرف یہی نہیں بلکہ سی بی ڈی اس بات کو بھی یقینی بناتا ہے کہ مقامی علم اور وسائل کو استعمال میں لاتے ہوئے کاروبار سے جو بھی منافع حاصل ہو، اس کو مقامی لوگوں کے ساتھ برابری کی بنیاد پر تقسیم کیا جائے۔ سی بی ڈی ملکوں کو اختیار دیتا ہے کہ وہ اپنے حیاتیاتی وسائل کو جیسے چاہے استعمال کریں (یہ امر قابل ذکر ہے کہ امریکہ نے اس کنونشن کی بھی تصدیق نہیں کی)۔ ڈبلیو ٹی او اپنے اندر ذہنی ملکیت کا معاہدہ (ٹرپس) سموئے ہوئے ہے جو سی بی ڈی میں دیے گئے حقوق کی مکمل نفی کرتا ہے۔ ذہنی ملکیت کے معاہدے اور یو پی او وی کنونشن ۱۹۹۱ء کے باعث اب بائیوڈائیورسٹی سے حاصل کیے ہوئے اشیاء پر سے عوامی اختیارات بین الاقوامی کمپنیوں کو منتقل ہو گئے ہیں یعنی اگر کمپنیاں جینیاتی مواد کو دریافت کرتی ہیں تو اس پر اپنی ذہنی ملکیت کی چھاپ لگا سکتی ہیں اور اس طرح تیسری دنیا کے کسان اور وہ مقامی گروہ جو ہزاروں طرح کے پھل اور پودے دنیا کی غذائی ذخیرے میں جمع کرنے کے باعث بنے ہیں، اس حق سے محروم ہو گئے ہیں کہ اس مواد پر مزید اختیار برقرار رکھ سکیں یعنی پائیدار ترقی کا حصول کمپنیوں کو

اختیارات دینے کے بعد ناممکن بنادیا گیا ہے۔

ڈبلیو ٹی او کے قوانین ملکوں کو پابند کرتے ہیں کہ وہ آزاد تجارت یا گلوبلائزیشن کے لیے راہیں ہموار کریں۔ غیر ملکی کمپنیوں کا منڈی تک آسان رسائی اور ان کو مراعات فراہم کرنے کے لیے قوانین کے نفاذ کے لیے ملکی سطح پر مسلسل دباؤ ڈالا جاتا ہے حالانکہ یہ قوانین انسانی فلاح اور ماحولیات کے نقطہ نظر سے کسی طرح بھی پائیدار ترقی کے اصولوں سے مطابقت نہیں رکھتے جبکہ دوسری طرف سی بی ڈی جیسے معاہدے جو اقوام متحدہ کے تحت بنائے جاتے ہیں، قانونی حیثیت نہیں رکھتے۔

آزاد تجارت اور پائیدار ترقی کو ایک دوسرے کی ضد کے طور پر دیکھا جاتا ہے کیونکہ آزاد تجارت کے پیچھے امریکہ یورپ، جاپان اور عالمی مالیاتی ادارے جیسی سامراجی طاقتیں کھڑی ہیں جن سے وابستہ بین الاقوامی کمپنیاں ہر قسم کی تنقید کے باوجود دنیا بھر میں غربت میں اضافے اور ماحولیاتی آلودگی بڑھانے پر بضد ہیں کیونکہ انسانی فلاح اور ماحولیاتی بہتری کی ہر کوشش ان کمپنیوں کے منافع میں رکاوٹ کا باعث بنتی ہیں۔

آزاد تجارت کی پالیسیوں کے تحت کمپنیوں کو جو طاقت ملی ہے وہ ملکوں کو بے بس کرتی ہے اور کمپنیوں کے سرمایہ میں بے انتہا اضافہ کا باعث ہے۔ دنیا کی کئی کمپنیاں ایسی ہیں جن کی مصنوعات کی سالانہ فروخت کئی ملکوں کے سالانہ بجٹ سے زیادہ ہے۔ ان تمام کمپنیوں کا تعلق پہلی دنیا سے ہے۔ آزاد معیشت میں کمپنیوں کو ملکوں پر فوقیت دی جاتی ہے مثلاً فلپائن میں ہوئیکسٹ، جو کہ ایک بہت بڑی جرمن کیڑے مار ادویات تیار کرنے والی کمپنی ہے، تھائیوڈان نامی کیڑے مار دوا بناتی تھی جس کے باعث عورتوں کو کینسر لاحق ہوسکتا ہے۔ فلپائن کے ادویات کے ادارے نے اس پر دو سال کے لیے پابندی لگادی، مگر ہوئیکسٹ مقامی عدالت سے اسی دوا کو بنانے کی اجازت دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ بات یہیں تک محدود نہیں رہی فلپائن پیسٹی سائیڈ ایکشن نیٹ ورک کے ڈائریکٹر ڈاکٹر رومی کوئیجانو، جنہوں نے ایک ورکشاپ کے دوران یہ کہا تھا کہ تھائیوڈان کا استعمال عورتوں میں کینسر کا باعث بن سکتا ہے، پر مقدمہ دائر کردیا۔

ایسی ہزاروں مثالیں موجود ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح بین الاقوامی کمپنیاں اپنے منافع کی خاطر ہزاروں لاکھوں انسانوں کی زندگی اور ماحولیات سے کھیلتی ہیں اور اس راہ میں حائل ہونے والی ہر رکاوٹ کو کیسے عبور کرتی ہیں۔ ان کمپنیوں کی طاقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ دنیا کی ۸۰ فیصد زیر کاشت زمین بڑی کمپنیوں کی ملکیت ہے، جب کہ دنیا کی ۲۰ بڑی کمپنیاں ۹۰ فیصد کیڑے مارنے والی ادویات اور بیج کا کاروبار کرتی ہیں۔

ایک اور مثال ہالینڈ سے تعلق رکھنے والی کمپنی شیل کی ہے، یہ کمپنی نائیجیریا میں ۱۹۵۸ء سے تیل نکالنے میں مصروف ہے اور اپنی مجموعی پیداوار کا ۱۴ فیصد تیل یہیں سے حاصل کرتی ہے۔ نائیجیریا میں شیل کی پائپ لائین سطح زمین سے اوپر بچھی ہوئی ہے یہ لائینیں گاؤں اور زیر کاشت زمین سے ہوکر گزرتی ہیں۔ گیس کی وجہ سے لوگوں کی صحت مستقل متاثر ہورہی ہے اور لوگ اپنے کھیتوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں، جس کے نتیجے میں نائیجیریا میں غربت کی شرح افریقہ کی مجموعی شرح سے بھی زیادہ ہے۔ ان حالات میں نوجوانوں کی بڑی تعداد روزگار کی تلاش میں شہروں کا رخ کررہی ہے۔ مقامی لوگوں نے ماحول اور معاشرے پر منفی اثرات کے جرمانے کے طور پر کمپنی سے ۱۰ ملین ڈالر ہرجانے اور پائپ لائن کو زیر زمین بچھانے کا مطالبہ کیا۔ شیل اور مقامی آبادی کے درمیان تنازعہ تصادم کی صورت اختیار کرگیا۔ ۱۹۹۰ء میں پولیس نے ۸۰ غیر مسلح دیہاتیوں کو ان کے لیڈر سمیت گرفتار کرلیا۔ جب کمپنی نے انتظامیہ سے مدد کی درخواست کی تو نائیجیریا کی عدالت نے شیل کی سرگرمیوں پر تنقید کی اور کہا کہ شیل، تیل کی فروخت سے جو منافع کماتی ہے اس کا زیادہ تر حصہ ان لوگوں کو ملنا چاہیے جن سے زمین لی گئی ہے۔ شیل کے خلاف ۱۹۹۳ء میں تقریباً ایک لاکھ لوگوں نے مظاہرہ کیا اور مطالبہ کیا کہ شیل انکے مطالبات تسلیم کرے جس کے نتیجہ میں نائیجیریا کی آرمی طلب کی گئی اور مظاہرین کو منتشر کیا گیا۔

یہ بات اب ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ آزاد تجارت کی پالیسیاں اور ڈبلیو ٹی او کے معاہدے عام لوگوں کے بجائے بڑی بڑی کمپنیوں کے مفاد میں ہیں، دوسرے الفاظ میں یہ ادارے اور ان کی پالیسیاں کمپنیوں کو مزید تقویت بخشنے کے ساتھ ساتھ قانونی جواز فراہم کرتی ہیں تاکہ ان کمپنیوں پر کسی قسم کی گرفت نہ ہوسکے۔ اوپر بیان کی گئی مثالیں اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ حکومتوں کو کس حد تک کمپنیوں کے مفاد کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ قطع نظر اس کہ اس سے کسی ملک کی مقامی آبادی مضرترین آب وہوا میں رہیں یا اس ملک کی مقامی صنعت تباہ ہو، حکومتیں پابند ہیں کہ آزاد تجارت کی راہ میں حائل تمام رکاوٹوں کو اپنی تمام تر طاقت کے ساتھ دور کریں۔ ایک طرف آزاد تجارت کی پالیسیاں ہیں جو کہ دنیا میں ماحول اور پائیدار ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں تو دوسری طرف پائیدار ترقی کے لیے معاشی بہبود کو ضروری قرار دیا جاتا ہے۔ کیا یہ تضاد خود پائیدار ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہے؟ کیونکہ کوئی بھی سرمایہ دار ایسا عمل کیوں کر کرسکتا ہے جس سے اس کا منافع کم ہوا، مثال کے طور پر کیا شیل اپنا کام نائیجیریا میں بند کرسکتی ہے؟ جہاں سے یہ اپنی مجموعی پیداوار کا ۱۴ فیصد تیل حاصل کرتی ہے یا پھر تھائیوڈان جیسی مضر صحت کیڑے مار ادویات بنانے والی کمپنی ہوئیکسٹ اپنا کام بند کردے گی کہ ان کی مصنوعات کے باعث دنیا کے ماحول میں منفی اثرات مرتب ہورہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے تمام مسائل کی طرح پائیدار ترقی کے حصول کی جدوجہد کے بارے میں بھی کئی نقطہ نظر پائے جاتے ہیں جن میں سے اہم ترین درج ذیل ہیں:

- موجودہ ترقی کی سمت اس صورت میں درست ہوسکتی ہے جب اس میں انسانی ضروریات اور ماحول کو اولیت دی جائے۔ ان خیالات کے پرچار کرنے والے اداروں میں اقوام متحدہ اور ورلڈ بینک جیسے ادارے شامل ہیں۔ لیکن ورلڈ بینک اس کے ساتھ اس بات کی بھی وکالت کرتا ہے کہ عالمی ترقی کے اس خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لیے آزاد تجارت کا راستہ اپنایا جائے، حکومتی کنٹرول کا خاتمہ کیا جائے اور بین الاقوامی اداروں کو کاروبار کرنے کی کھلی چھوٹ دی جائے ان اداروں کا استدلال ہے کہ عالمی غربت کے خاتمے کی طرف ایک قدم کے طور پر خوراک کے لیے وضع کردہ جدید ٹیکنالوجی کو استعمال کیا جاسکتا ہے۔ دنیا بھر کا حکمران طبقہ ان خیالات کا حامل ہے جو سمجھتے ہیں کہ گلوبلائزیشن ایک ناگزیر عمل ہے اور اس سے نمٹنے کے لیے ہر ملک کو آزاد تجارتی

اصولوں کے تحت تیاری کرنی چاہیے۔

-گلوبلائزیشن مخالف تحریک میں شامل ایک بڑے حلقے کا خیال ہے کہ دنیا میں غربت اور ماحولیاتی مسائل کی ایک اہم وجہ آزاد تجارت کا جدید نظام ہے۔ اس مکتبہ فکر کے نزدیک اس کی ابتداء آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے انتظامی ڈھانچے کے پروگرام (سیپ) سے ہوئی اور آزاد تجارت کے مزید مستحکم کرنے کی خاطر ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن قائم کیا گیا ہے۔ یہ تمام ادارے حکومتی کنٹرول کا خاتمہ کرکے اس کی جگہ ڈبلیو ٹی او کی آزاد تجارتی اصولوں کا عالمی سطح پر نفاذ چاہتے ہیں۔ گلوبلائزیشن مخالف تحریک میں شامل اکثر بین الاقوامی تسلط کے بجائے حکومتی کنٹرول کو ترجیح دیتے ہیں۔ البتہ ان میں سے اکثر گلوبلائزیشن کے پھیلاؤ کو ناگزیر بھی سمجھتے ہیں۔ اس تحریک سے وابستہ گروہ ہیں ایسی پالیسیوں کو ترجیح دیتے ہیں جن سے ان کے مفادات کی حفاظت ہوتی رہے۔ اس میں زیادہ تر وہ طبقہ شامل ہے جو تیسری دنیا میں آسائش کی زندگی بسر کررہا ہے۔ اسی گروپ میں وہ گروہ بھی شامل ہیں جو صنعتی انقلاب سے اب تک ہونے والی ترقی کے خلاف ہیں اور یہ خاص طور پر تیسری دنیا کے لیے ترقی کے موجودہ منصوبوں اور آزاد تجارت کو ایک نئے نوآبادیاتی نظام کے طور پر دیکھتے ہیں۔ یہ روایتی کھیتی باڑی اور سابقہ جاگیرداری نظام کو بہتر سمجھتے ہیں۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت ہونے والی تقریباً تمام ہی ترقی کو رد کرتے ہیں۔ گلوبلائزیشن مخالف تحریک میں اکثریت کا تعلق اصلاح پسند گروہوں سے ہے۔

-انقلابی خیالات رکھنے والے گروہ کا خیال ہے کہ غربت اور ماحولیات کا مسئلہ اس لیے موجود ہے کیونکہ سماج طبقات میں بٹا ہوا ہے۔ اگر منصوبہ بندی اور ترقی کی بنیاد حکمراں طبقہ کے مفادات کے برعکس معاشرے کے ایک عام فرد کی خواہشات کے مطابق رکھی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ غربت اور ماحولیاتی مسائل پر قابو نہ پایا جاسکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ ترقی کی بنیاد سرمایہ دارانہ مفادات ہیں، جن کا مطمع نظر صرف منافع کا حصول ہے۔ اپنی حکمرانی اور مراعات کے مفادات کے لیے وہ کروڑوں عوام اور کرہ ارض کی تباہی کو نظرانداز کیے ہوئے ہیں۔ اگر عوامی مفادات کو پیش نظر رکھا جائے تو سائنسی ترقی کو استعمال کرتے ہوئے دنیا سے بھوک وافلاس اور ماحولیاتی بگاڑ کا خاتمہ ممکن ہے۔ یہ مکتبہ فکر ورلڈ بینک، آئی ایم ایف اور ڈبلیو ٹی او کے خاتمے کو ہی کافی نہیں سمجھتے بلکہ استحصالی نظام کے مکمل خاتمے کی بات کرتے ہیں۔

۱۹۹۲ء کی ریو کانفرنس کے بعد اہم کانفرنسیں

- ۱۹۹۷ء میں ریو+۵، کے نام سے منعقد ہونے والی کانفرنس میں ایجنڈا ۲۱ پر مزید تبصرہ ہوا غربت کا خاتمہ امیر وغریب ممالک میں اشیاء کے استعمال میں توازن کے علاوہ جو موضوعات پر خاص طور پر زیر بحث آئے ان میں ماحولیات اور تجارت شامل ہیں۔
- اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے ۵۵ ویں سیشن میں کانفرنس برائے ماحولیات اور ترقی (ریو کانفرنس) کے جائزے کے لیے عالمی کانفرنس برائے پائیدار ترقی (ریو+۱۰ یا ڈبلیو ایس ایس ڈی) کو، ستمبر ۲۰۰۲ء، جنوبی افریقہ کے شہر جوہانس برگ میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ڈبلیو ایس ایس ڈی ان موضوعات کا جائزہ لے گی جو ایجنڈا ۲۱ کو مکمل طور پر نافذ کرنے کے لیے ضروری ہیں۔
- ڈبلیو ایس ایس ڈی کی تیاری کی خاطر دنیا کے مختلف خطوں میں جون تا اکتوبر ۲۰۰۱ء اجلاس منعقد کیے گئے۔ ان اجلاسوں میں مختلف خطوں کے ممالک کے نمائندے شریک ہوئے۔
- ڈبلیو ایس ایس ڈی کی تیاری کے سلسلے کا دوسرا اجلاس اس سال نیویارک میں ۲۸، جنوری تا ۸، فروری منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں مختلف گروہوں سے وابستہ تیار کردہ مسودے پر بات چیت ہوئی۔
- ڈبلیو ایس ایس ڈی کی تیاری کے سلسلے کا تیسرا اجلاس اس سال نیویارک میں ۲۵، مارچ تا ۵، اپریل، منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں کمیشن برائے پائیدار ترقی کے پہلے مسودے پر کام ہوا۔
- ڈبلیو ایس ایس ڈی کی تیاری کے سلسلے کا چوتھا اجلاس اس سال انڈونیشیاء میں ۲۷، مئی تا ۷، جون منعقد ہوگا۔ اس اجلاس میں ڈبلیو ایس ایس ڈی میں پیش کیے جانے والے مسودے میں موجود مسائل پر تبادلہ خیال ہوگا۔
- ہر ملک میں پائیدار ترقی کے حصول کے لیے ایک ایسے مسودے کی تیاری ہورہی ہے جو اس کی عوام اور حکومت کو درپیش ان معاشی، معاشرتی اور سیاسی مسائل کی نشاندہی کرے جو اس مقصد کے حصول میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ پاکستان میں قومی سطح پر مشاورتی اجلاس مئی میں اسلام آباد میں آئی یو سی این کے تعاون سے منعقد ہونے والا ہے۔
- دنیا میں منعقد ہونے والی عوامی مشاورت سے یہ بات سامنے آرہی ہے کہ گلوبلائزیشن اور اس سے جڑی ہوئی جدید آزاد تجارت، پائیدار ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

تازہ ترین صورتحال یہ ہے کہ جو تنقید اب تک ہونے والی ترقی پر کی گئی، عالمی مالیاتی اداروں نے انہیں ترک کرنے کے بجائے انہی منصوبوں کو نئے ناموں مثلاً غربت میں کمی اور پائیدار ترقی کے نام سے متعارف کرانا شروع کردیا ہے۔ ۱۹۵۰ء کے بعد دنیا میں ترقی کا سب سے بڑا دعویدار ورلڈ بینک رہا ہے اور اس کی پالیسیاں سب سے زیادہ تنقید کی زد میں آئی ہیں۔ شاید اسی لیے سب سے پہلے ورلڈ بینک کے موجودہ صدر نے تنقید میں کمی کی خاطر غربت میں کمی کو اپنا نعرہ بنایا ہے۔ دوسرے اداروں نے اس کی تقلید کی مثلاً ایشیائی ترقیاتی بینک نے غربت میں کمی اور ماحولیاتی تحفظ کے ساتھ ایسی معاشی ترقی پالیسی اپنائی ہے جو ''غریبوں کی حمایت'' اور ''پائیدار ترقی'' کی طرف جھکاؤ رکھتی ہو۔

پائیدار ترقی اور ترقی برائے آزاد تجارت یعنی گلوبلائزیشن کا سب سے بڑا تضاد یہی ہے کہ پائیدار ترقی ماحولیات، موجودہ اور مستقبل میں آنے والی نسلوں کی تحفظ اور مساوات کو ساتھ لے کر چلتی ہے جب کہ آزاد تجارت صرف معاشی ترقی اور منافع کو اپنا محور بناتی ہے، یقیناً دونوں کا امتزاج ناممکن ہے۔

حوالہ جات:

اس مضمون کی تیاری میں دی نیوز اور ڈان، کراچی، مختلف ویب سائٹ اور درج ذیل کتابوں اور رپورٹ سے استفادہ کیا گیا ہے۔

۱۔ جیڈ گریئر اور کینی برونو، گرین واش: دی ریالٹی بی ہائینڈ کارپوریٹ اینوائرمنٹلزم، آئی بون فاؤنڈیشن، تھرڈ ورلڈ نیٹ ورک ۱۹۹۸ء۔

۲۔ مینا ویلکی (ایڈیٹر) فنش ایکشن فار سسٹین ایبل ڈیولپمنٹ: وزارت ماحولیات، فن لینڈ، ۱۹۹۵ء۔

۳۔ ایڈ واچ، اے پی آر این، کارپوریٹ پاور آر پیپلز پاور: ٹی این سیز اینڈ گلوبلائزیشن، ۲۷-۲۹، دسمبر ۲۰۰۱ء، ورکشاپ پیپرز۔

۴۔ گرو ہارلیم برانڈٹ لینڈ (چیئرمین) آور کامن فیوچر: دی ورلڈ کمیشن آن اینوائرمنٹ اینڈ ڈیولپمنٹ، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۱ء۔